معارف

دسمبر ۲۰۱۶ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰؍روپئے۔ فی شمارہ ۲۵؍روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴؍روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰؍روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰؍روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Office Mobile) 09170060782

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری؍منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۸ | ماہ ربیع الاول ۱۴۳۸ھ مطابق ماہ دسمبر ۲۰۱۶ء | عدد ۶

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات — ۳۲۲
اشتیاق احمد ظلی

مقالات
امام اعظمؒ اور اصول حدیث — ۳۲۵
ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس
تاریخِ نوائط۔ بعض مسائل — ۳۳۹
ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی
براؤن اور شبلی — ۳۵۹
جناب آصف نعیم
شیخ محمد بن عبدالوہاب، مولانا مسعود عالم ندوی کی نظر میں — ۳۶۸
پروفیسر مسعود عالم فلاحی

اخبار علمیہ — ۳۸۰
ک۔ ص اصلاحی

آثار علمیہ و تاریخیہ
مولانا عبدالماجد دریابادی کے خطوط، ڈاکٹر سید سلمان ندوی کے نام — ۳۸۳

تلخیص و ترجمہ
الناسخ والمنسوخ — ۳۸۷
فضل الرحمٰن اصلاحی

معارف کی ڈاک
تہذیب قوم نوحؑ و ادریسؑ — ۳۹۲
جناب راجو خان
فارسی تراجم و ہندوستانی مذاہب — ۳۹۴
ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا

وفیات
آہ! ڈاکٹر خلیق انجم مرحوم — ۳۹۶
ع۔ص

ادبیات
حمد باری تعالیٰ/ عظمت رسولؐ — ۳۹۸
جناب سلمان غازی/ جناب انس مسرور انصاری

مطبوعات جدیدہ — ۳۹۹
ع۔ص

رسید کتب موصولہ — ۴۰۰

شذرات

علامہ شبلی سے مولانا ابوالکلام آزاد کی عقیدت و محبت اور ان کی یادگار دارالمصنّفین سے ان کے تعلقِ خاطر سے اہل علم بخوبی آگاہ ہیں۔ شاید اسی خصوصی تعلق کے باعث مولانا آزاد اردو نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے ذمہ داروں نے دارالمصنّفین کے اس خادم کو اس سال مولانا آزاد میموریل لکچر کے لیے مدعو کیا۔ میموریل لکچر کا اہتمام ہر سال مولانا آزاد کے یوم پیدائش ۱۱/نومبر کو کیا جاتا ہے اور یہ اس مناسبت سے منعقد کی جانے والی ایک ہفتہ پر پھیلی ہوئی تقریبات کا آخری پروگرام ہوتا ہے۔ اس وقت ملک میں پائی جانے والی مخصوص صورت حال کے پس منظر میں راقم حروف نے گفتگو کے لیے ”مولانا آزاد کے سیاسی افکار“ کا موضوع منتخب کیا۔ وطن عزیز کی آزادی اور آزاد ہندوستان کی تعمیر و تشکیل میں مولانا آزاد کا کردار غیر معمولی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ جد و جہدِ آزادی کے نہایت حسّاس اور فیصلہ کن مرحلہ میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک مسلسل کانگریس کی صدارت ان کی غیر معمولی سیاسی بصیرت اور قائدانہ صلاحیت کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ جس پامردی اور استقلال سے وہ اپنے نظریات پر قائم رہے وہ عدیم المثال ہے۔ ایک وہی تھے جنھوں نے آخر تک تقسیم ملک کی مخالفت کی لیکن وہ اپنے اس مشن میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ تاریخ میں ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا جب جذبات کا پلہ بھاری رہا اور ایک سچے بہی خواہ کی بات نہیں سنی گئی۔ یہ حقیقت اس المیہ کی شدت کو اور بڑھا دیتی ہے کہ اس بحرانی اور ہنگامہ خیز دور میں بھی مولانا آزاد اپنی غیر معمولی سیاسی بصیرت کی وجہ سے تقسیم ملک کے بعد ابھرنے والی صورت کو واضح طور پر دیکھ اور محسوس کر رہے تھے۔ ان کے لیے شکستِ خواب کا کرب کتنا جاں گسل رہا ہوگا اس کا اندازہ کرنا ممکن نہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان حالات میں وہ اپنے آپ کو ”وطن میں غریب الدیار“ اور ”ایک دور افتادہ صدا“ کہتے ہیں۔ ان سب کے باوجود ان کے سیاسی افکار کی معنویت نہ صرف آج بھی باقی ہے بلکہ برداشت، یکجہتی اور رواداری کے غیر معمولی حد تک فقدان کے اس دور میں ان کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ ایک ایسے مستقبل کی طرف پیش قدمی کے لیے جس میں ملک میں رہنے بسنے والے تمام لوگ باہمی اعتماد، محبت، امن اور آشتی کے ساتھ رہ سکیں مولانا آزاد کے سیاسی افکار کی بازیافت اور ان کی روشنی میں ملکی سیاست کی تعمیرِ نو ناگزیر ہے۔ ان کا قومی یکجہتی، اتحاد اور یگانگت کا پیغام آج پہلے سے بھی زیادہ معنویت اور اہمیت کا حامل ہے۔

مولانا آزاد اردو نیشنل یونیورسٹی، حیدرآباد اپنے انداز کی ایک منفرد مرکزی اردو یونیورسٹی ہے۔ اس کی تاسیس ۱۹۹۸ء میں اردو زبان کی ترویج وترقی کے مقصد سے کی گئی تھی۔ ۲۰۰ ایکڑ کے رقبہ پر پھیلا ہوا اس کا وسیع اور خوبصورت کیمپس دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

اس خطہ کے فطری حسن کو انسانی کاوش نے جنت نگاہ بنا دیا ہے۔ اس دانش گاہ نے اپنی کم عمری کے باوجود اپنا علمی سفر بڑے امتیاز اور تیز رفتاری سے طے کیا ہے۔ ایک طرف تو اس نے ملک کے طول وعرض میں اپنی تعلیمی شاخوں کا ایک جال بچھا دیا ہے تو دوسری طرف لگاتار ۲۰۰۹ء اور ۲۰۱۶ء میں NAAK سے A گریڈ حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ اس کے موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب نے جب سے اس کی زمام قیادت سنبھالی ہے اس میں ایک نئی زندگی کی آہٹ صاف طور پر محسوس کی جا سکتی ہے اور ایک نئے جذبہ اور مقصدیت کی کارفرمائی ہر طرف دکھائی دیتی ہے۔ جس ولولہ، لگن اور اخلاص سے وہ اس شہر اردو جسے شہر آرزو کہیں تو بے جا نہ ہو، کی تعمیر میں مصروف ہیں اس کو دیکھ کر دل سے دعا نکلتی ہے۔ ان کی قیادت اور رہنمائی میں جناب انیس احسن اعظمی، چیف کنسلٹنٹ، مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت اور ان کے رفقاء کار نے یونیورسٹی برادری کے تعاون سے اس سال مولانا آزاد ہفتہ کا جس انداز اور سلیقہ سے اہتمام کیا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ پورے کیمپس کو بڑے خوبصورت انداز میں سجایا اور سنوارا گیا تھا۔ اہم جگہوں پر مناسب حال پوسٹرز کے ذریعہ یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد کو موثر انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی پورے ہفتہ کامیاب پروگراموں کا ایک سلسلہ جاری رہا جس میں یونیورسٹی برادری نے بڑے جوش اور جذبہ سے حصہ لیا۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی مولانا آزاد میموریل لکچر تھا۔ یونیورسٹی میں دو دن کا قیام ایک خوش گوار تجربہ تھا۔ وہاں کے احباب خصوصاً جناب انیس احسن اعظمی، پروفیسر ابوالکلام اور ڈاکٹر دانش معین کی کرم فرمائیوں کی یاد تادیر دل میں باقی رہے گی۔

میانمار میں آنگ سان سوکی کی قیادت میں حکومت قائم ہوئے اب کچھ عرصہ گذر چکا ہے۔ اگرچہ انہوں نے الیکشن میں اپنی پارٹی کی طرف سے ایک مسلم امیدوار بھی نامزد نہیں کیا تھا اور طویل عرصہ سے روہنگیا مسلمانوں کے خلاف ہونے والے مظالم کے سلسلہ میں مسلسل خاموشی اختیار کر رکھی تھی، اس کے باوجود وہاں کے مسلمانوں نے اجتماعی طور پر ان کی پارٹی کو ووٹ دیا۔ ان کی حکومت قائم ہونے کی

صورت میں مسلمانوں کو حالات میں بہتری کی امید تھی۔لیکن نہ صرف یہ کہ یہ توقعات کسی درجہ میں بھی پوری نہیں ہوئیں بلکہ حالات پہلے سے بھی کہیں زیادہ خراب ہوگئے۔دنیا میانمار میں آزادی اور انسانی حقوق کی ایک نئی صبح کے طلوع کی خوشی منا رہی ہے اور میانمار کے خلاف عائد پابندیاں ایک ایک کر کے ختم کی جارہی ہیں اور دوسری طرف راخین میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ خاص طور سے اکتوبر کی ابتدا سے ایک پولس چوکی پر حملہ کو بہانہ بنا کر ظلم و بربریت کا جو سلسلہ شروع ہوا اس نے کھلی ہوئی نسل کشی کی صورت اختیار کر لی ہے۔گذشتہ دو مہینہ سے فوج نے اس پورے علاقہ کو سیل کر رکھا ہے۔صحافیوں اور امدادی کارکنوں کو بھی وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے۔دنیا سے اس خطہ کا رابطہ مکمل طور پر منقطع ہو چکا ہے۔ایسے حالات پیدا کر دیے گئے ہیں کہ لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو جائیں اور اس طرح اس علاقہ سے مسلمانوں کا وجود ختم کر دیا جائے جہاں وہ جانے کتنی نسلوں سے رہتے بستے آئے ہیں۔جو نہیں جا سکتے ان کو نہایت بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔گھروں کو آگ لگا دی جاتی ہے اور اس طرح وہاں سے ان کا نام و نشان مٹا دیا جاتا ہے۔فوجی وردی میں یہ وحشی مسلم خواتین کے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں اس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔بچوں کے لیے نہ دوا دستیاب ہے اور نہ غذا۔ان سب کے باوجود وہاں کی اس خاتون حکمراں نے جسے ۱۹۹۱ء میں امن نوبل انعام سے نوازا گیا اور جس کا استقبال دنیا نے انسانی حقوق کے ایک نڈر علم بردار کی حیثیت سے کیا تھا، اس سلسلہ میں کوئی بیان تک دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔اس کی مذمت یا اس کے خلاف کارروائی تو بہت دور کی بات ہے۔بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ روہنگیا مسلمانوں کے خلاف اس سفاکانہ مہم میں فوج کو ان کی حمایت حاصل ہے۔اس سلسلہ میں انسانی حقوق کی بعض تنظیموں نے ایسی سرکاری دستاویزات کا انکشاف کیا ہے جن سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اس مہم کا مقصد مسلمانوں کی نسل کشی ہے اور حکومت اس خطہ کو پوری طرح مسلمانوں سے خالی کرانا چاہتی ہے۔ان بدنصیب روہنگیا مسلمانوں کے لیے جن کے حالِ زار سے عام طور پر دنیا کے مسلمان بھی کچھ زیادہ واقف نہیں ہیں، کوئی جائے پناہ بھی نہیں ہے۔ پڑوسی مسلم ملک بنگلہ دیش نے ان کے لیے اپنی سرحدوں کو بند کر رکھا ہے اور جو وہاں گزین کیمپوں میں مقیم ہیں ان کی حالت قابل رحم ہے۔یہ ایک سنگین المیہ ہے اور عالم اسلام اور مسلمانان عالم کو اس کی طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

مقالات

امام اعظم اور اصول حدیث

ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس

حدیث مصطفوی، شریعت اسلامی کا بنیادی ماخذ تو ہے ہی اسلامی تہذیب کی اساس واکائی بھی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات نہ صرف قرآن فہمی کی بنیاد فراہم کرتے ہیں بلکہ قرآن کی روح کو معاشرہ میں جاری رکھنے کا ذریعہ بھی ہیں۔مسلم معاشرہ ہمیشہ انسانی رویوں کی تشکیل وتعمیر میں آپؐ کی ذات اقدس سے رہنمائی لیتا ہے۔معاشرہ میں جب بھی انحرافی رویوں نے جنم لیا تو اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ بعض لوگوں نے قرآن صامت پر عمل کی آڑ میں قرآن ناطق کو چھوڑنے کا اعلان کیا۔ایسا کرنے والے جدید وقدیم معتزلہ کو مسلم معاشرہ نے یکسر نظر انداز کر دیا، یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مسلم معاشرہ کی وحدت وعظمت کا راز ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

علم حدیث کی ترویج واشاعت کے لیے دو طرح سے کوششیں سامنے آتی ہیں ایک جو محدثین نے کیں اور دوسری جو فقہاء نے کیں۔سند ومتن کی حفاظت وصیانت کے لیے محدثین نے شب وروز وقف کر دیے تو فقہاء نے ان احادیث کے معانی، مطالب اور ان سے اخذ واستنباط مسائل کے لیے اپنی توانائیاں صرف کیں۔دونوں نے خدمت دین کے لازوال کارنامے سرانجام دیے اور امت ان کے احسانات سے کبھی بھی سبک دوش نہیں ہو سکتی۔دونوں کے کام میں ایک لطیف فرق ضرور رہا کہ اول الذکر کا کام علمی نوعیت اور ثانی الذکر کے کام پر عملیت کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔اسی لیے امام ترمذی نے کہا:

الفقهاء اعلم بمعاني الحديث۔فقہا بہتر جانتے ہیں کہ حدیث کا معنی کیا ہے، ثانی الذکر

چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی، لاہور۔

گروہ کے کام کی تحسین امام احمد بن حنبل نے ان الفاظ میں کی معرفة الحدیث و الفقه فیه احب الی من حفظه۔(۱)

حدیث کی معرفت اور اس کی فقہ میرے نزدیک اسے یاد کرنے سے بہتر ہے۔امام ابن ابی حاتم رازی فقہاء کی روایات کو ترجیح دیتے ہوئے اپنی رائے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کان حدیث الفقهاء احب الیهم من حدیث المشیخة معروف تابعی اعمش نے فقہاء میں متداول حدیث کو ترجیح دیتے ہوئے لکھا حدیث یتداوله الفقهاء خیر من حدیث یتداوله الشیوخ (۲) یعنی جو حدیث فقہاء میں متداول ہو وہ اس حدیث سے بہتر ہے جو محدثین میں متداول ہو۔ مولانا عبدالحئی لکھنوی کے پیش نظر ایسی ہی تصریحات تھیں جن کی وجہ سے انہوں نے یہ فیصلہ کیا۔

الفقیه اولی بان یوخذ منه الحدیث ۔(۳)	فقیہ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے حدیث اخذ کی جائے۔

امام محمدؒ نے اس حقیقت کو بایں الفاظ بیان فرمایا:

"حدیث درست نہیں رہتی مگر فقہ کے ساتھ اور فقہ درست نہیں رہتی مگر حدیث کے ساتھ یہاں تک کہ جو دونوں میں سے ایک میں لائق ہو اور دوسری میں نہ ہو وہ منصب قضاء وفتوی کے لائق نہیں۔ کیونکہ محدث جو فقیہ نہ ہو اکثر غلطی کرتا ہے"۔(۴)

علمائے امت کی ان آراء کی روشنی میں اگر ہم فقہاء کی خدمت حدیث کا جائزہ لیں تو امام اعظمؒ کی خدمات اساسی وکلیدی نظر آئیں گی۔علامہ سیوطی نے شمس الدین محمد بن یوسف الصالحی مولف السیر ۃ الشامیة کا قول عقود الجمان سے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ محدثین کے اعیان حفاظ میں سے تھے۔امام ذہبی نے اپنی کتاب الممتع اور طبقات الحفاظ المحدثین میں حضرت امام کا ذکر کیا ہے اور خوب کیا ہے۔اور کہا ہے اگر حضرت امام ابوحنیفہ نعمان کا حدیث سے زیادہ تعلق نہ ہوتا، تو وہ مسائل فقیہہ کا استنباط نہ کر سکتے کیونکہ آپ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ادلہ سے استنباط کیا۔(۵)

احادیث پر امام صاحب کی گہری نظر اور ان سے استخراج مسائل کے بارے میں امام شعرانی ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

''میں نے بحمد اللہ امام ابوحنیفہ کے اقوال اور ان کے اصحاب کے اقوال کا مطالعہ کیا جب میں نے کتاب ادلۃ المذاھب تالیف کی، پس میں نے ان کے اقوال یا ان کے اتباع کے اقوال میں سے کوئی ایسا قول نہ پایا جو کسی آیت یا حدیث یا اثر یا اس کے مفہوم یا حدیث ضعیف کثیر الطرق یا قیاس صحیح کی طرف مستند نہ ہو''۔(۶)

مرتضی زبیدی (م ۱۲۰۵ھ) نے ''عقود الجواھر المنیفۃ فی ادلۃ ابی حنیفۃ'' میں احکام سے متعلق ۵۵۵ وہ احادیث درج کی ہیں جن کی روایت امام ابوحنیفہ اپنی سند سے کرتے ہیں اور یہ وہ روایات ہیں جو ائمہ ستہ کی بیان کردہ روایات کے موافق ہیں۔ اگر علامہ زبیدی وہ روایات بھی درج کرتے جن کی دیگر ائمہ نے بھی تخریج کی ہے تو امام صاحب کی مرویات اس کتاب میں بہت زیادہ ہوتیں۔ کیونکہ یحییٰ بن نصر نے ان کے گھر احادیث کی کثیر کتب کا مشاہدہ کیا اور ان میں سے کچھ املا کیں۔ ان قرائن کی بنا پر ذہبی نے ان کا ذکر تذکرۃ الحفاظ میں کیا اور کہا کہ امام ابوحنیفہ نے عطا، نافع، عبدالرحمٰن بن ہرمز، اعرج، عدی بن ثابت، سلمہ بن کہیل، ابوجعفر محمد بن علی، قتادہ، عمرو بن دینار اور ابوالحسن وغیرہ کی ایک بڑی جماعت سے احادیث اخذ کیں۔(۷) ''تاریخ التشریع الاسلامی'' کے مصنف لکھتے ہیں کہ ''یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ وہ علم حدیث کے ایک بہت بڑے امام تھے اور ان سے ایک ہزار سے زیادہ راویوں نے موطا وغیرہ کے علاوہ ہزاروں احادیث اخذ کر کے روایات کی ہیں''۔(۸)

ان تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امام اعظم سید الفقہاء ہی نہیں امام المحدثین بھی ہیں۔

قبول حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کا اسلوب: امام اعظمؒ کے دور میں علوم وفنون باقاعدہ مدون نہ ہوئے تھے بعد والے لوگوں نے متقدمین کے اخذ واستنباط کے اسلوب ومنہج کی روشنی میں علم الاصول کی تدوین کی اور اصول حدیث تو اصول فقہ سے بھی بعد میں وجود میں آیا اور اصول حدیث پر اصول فقہ کے اثرات بالکل نمایاں اور واضح ہیں۔

جب اصول حدیث کی تدوین اصول فقہ سے بعد کی ہے تو یقیناً امام اعظمؒ کے ہاں مدون صورت میں سارے اصولی مباحث نہیں مل سکتے البتہ اصولوں کو مرتب کرنے کی بنیادیں اور اشارے ضرور دستیاب ہیں جن کو اصول فقہ پر لکھی گئیں کتب میں مختلف مباحث میں دیکھا جا سکتا ہے یا اصول

حدیث کی کتابوں میں امام صاحب کے اقوال مختلف مقامات پر نظر آئیں گے۔اسی طرح اسماء الرجال پر لکھی گئی کتب میں بھی اشارات پائے جاتے ہیں۔گویا امام صاحب کے احادیث سے اخذ واستنباط کے اصول، بنیادی طور پر تین طرح کی کتب میں مل سکتے ہیں:

ا: کتب اصول فقہ۔ ب: کتب اصول حدیث،شروح حدیث۔ ج: کتب اسماء الرجال۔

یہ بات طے ہے کہ ان کے ہاں اصول وضوابط کا معیار انتہائی سخت تھا۔وکیع کہتے ہیں:

''لقد وجد الورع عن ابی حنیفة فی الحدیث مالم یوجد عن غیرہ''۔(۹)

اسی طرح عبدالرحمٰن مبارک پوری بھی اس معاملہ میں ان کی سختی واحتیاط کے قائل ہیں(۱۰) امام صاحب میں حدیث کے بارے میں وہ احتیاط پائی گئی جو دوسروں میں نہ پائی گئی۔

اس غایت درجہ احتیاط کی وجہ بیان کرتے ہوئے پروفیسر عبدالقیوم لکھتے ہیں:

''امام ابوحنیفہؒ احادیث کے بارے میں بڑے محتاط تھے اور صرف وہی احادیث قبول کرتے جو مستند اور پختہ ذرائع سے پہنچتی ہوں۔آپ کے احتیاط کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ جس دور میں گذرے ہیں وہ دور سیاسی فتنوں اور سازشوں کا دور تھا.....اس گڑبڑ اور انتشار کے زمانے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ نے بڑی احتیاط سے کام لیا،لیکن اس کے باوجود آپ کے رفقا اور تلامذہ نے آپ کے ایسے پندرہ سولہ مجموعے روایت کیے ہیں جن کے راویوں کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ان مجموعوں کو قاضی القضاۃ ابوالموید خوارزمی (م ۶۵۵) نے جامع المسانید میں جمع کردیا ہے''۔(۱۱)

احادیث سے امام صاحب کے اخذ واستنباط کے اسلوب ومنہج کا ایک اجمالی جائزہ پیش خدمت ہے۔

حدیث ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت سے: امام اعظمؒ کے ہاں شریعت اسلامی کا بنیادی اور اہم رکن حدیث نبوی ہے۔اس حقیقت کو امام صاحب نے واضح طور پر بیان کردیا۔یہ بیان اس فکر کی نفی کردے گا کہ امام صاحب احادیث کو نظر انداز کرکے قیاس پر عمل کرتے تھے۔فرماتے ہیں:

آخذ بکتاب اللہ فان لم اجد فبسنة	میں کتاب اللہ کو لیتا ہوں اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں
رسول اللہ فان لم اجد فبقول الصحابة	نہیں پاتا تو رسول اللہ کی سنت کو لیتا ہوں۔اگر
اخذ بقول من شئت منھم ولا اخرج	سنت میں نہیں پاتا تو قول صحابہ کو لیتا ہوں۔ان میں
عن قولھم الی قول غیرھم فاذا انتھی	سے جس کا قول چاہوں اور ان کا قول چھوڑ کر غیر کا

الامر الی ابراھیم والشعبی وابن سیرین وعطاء فقوم اجتھدوا فاجتھد کما اجتھدوا۔(۱۲)

قول نہیں لیتا۔لیکن جب نوبت ابراہیم، شعبی، ابن سیرین وعطاء تک پہنچتی ہے تو وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اجتہاد کیا پس میں اجتہاد کرتا ہوں جس طرح انہوں نے اجتہاد کیا۔

وہ سنت پر سختی سے عمل کی بنا پر حدیث ضعیف کو قیاس پر ترجیح دیتے۔علامہ ابن حزم اندلسی ظاہری لکھتے ہیں:

قال ابو حنیفة : الخبر الضعیف عن رسول اللہ ﷺ اولی من القیاس ولا یحل القیاس مع وجودہ۔(۱۳)

کہ ابوحنیفہ کے ہاں خبر ضعیف قیاس سے اولی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے قیاس نہیں ہوسکتا۔

علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں ’’ابوحنیفہ یقدم الحدیث‘‘ کے زیر عنوان لکھا:

’’اصحاب ابوحنیفہؒ کا اس پر اتفاق ہے کہ ابوحنیفہ کے مذہب میں ضعیف حدیث بہتر ہے قیاس اور رائے سے، لہٰذا انہوں نے ضعیف حدیث کی وجہ سے سفر میں کھجور کی نبیذ سے وضو کرنے کو قیاس اور رائے پر مقدم رکھا ہے اور ایک ضعیف حدیث کی بنا پر دس درہم سے کم چوری میں ہاتھ کاٹنے سے روکا ہے اور ایک حدیث کی وجہ سے باوجودے کہ اس میں ضعف ہے، اکثر حیض دس دن قرار دیا ہے اور جمعہ کی نماز قائم کرنے کے لیے مصر (شہر) کی شرط اسی طرح کی حدیث سے رکھی ہے اور کنویں کے مسائل میں آثار غیر مرفوعہ کی وجہ سے قیاس محض کو چھوڑ دیا......اور سلف کے نزدیک حدیث ضعیف کی وہ اصطلاح نہیں ہے جو متاخرین کی ہے۔بلکہ جس کو متاخرین حسن کہتے ہیں، سلف اس کو ضعیف کہہ جاتے ہیں‘‘۔(۱۴)

حدیث سے اسی اخذ واستفادہ کی وجہ سے ابن حجر الہیثمی نے لکھا:

’’فتامل ھٰذا الاعتناء بالاحادیث وعظیم جلالتھا وموقعھا عندہ‘‘۔(۱۵)

حق ہے کہ امام اعظمؒ نے حدیث، سنت اور خبر میں فرق کو ملحوظ خاطر رکھا۔

امام جرح وتعدیل: راویوں کے احوال کے حوالے سے بھی امام ابوحنیفہ کی رائے کو اہم حیثیت

حاصل ہے۔ان کی رائے کو ائمہ جرح وتعدیل نے اہم جانا اور اسے دیگر ائمہ کے اقوال کے ساتھ پیش کیا، اس حوالہ سے امام سخاوی (۸۳۱-۹۰۲ھ) کے یہ الفاظ امام اعظم کی اس میدان میں جلالت شان کے آئینہ دار ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"جب متوسط تابعین ختم ہوئے اور تبع تابعین کا دور آیا یعنی ۱۵۰ھ کے آس پاس، تو بہت سے اماموں نے توثیق اور تجریح کی بات شروع کردی۔ چنانچہ ابوحنیفہ نے کہا: میں نے جابر الجعفی سے بڑھ کر جھوٹ بولنے والا نہیں دیکھا"۔(۱۶)

امام سخاوی کے اس قول سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جابر جعفی پر جرح میں امام اعظم کا صرف ایک قول پیش نہیں کیا بلکہ حتمی رائے کے طور پر امام صاحب کی جرح کو قبول کیا ہے۔ اس بات کو امام ترمذی (۲۰۹-۲۷۹ھ) نے زیادہ عمدہ پیرائے میں بیان کیا:

"حدثنا محمود بن غیلان حدثنا ابو یحییٰ الحمانی قال سمعت ابا حنیفة یقول: مارأیت احدا اکذب من جابر الجعفی و لا افضل من عطاء بن ابی رباح"۔(۱۷)

یہاں امام ترمذی نے جرح کے لیے استعمال ہونے والے لفظ اکذب اور تعدیل کے لیے افضل دونوں استعمال کیے۔

ان سے سفیان ثوریؒ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا وہ ثقہ ہیں، لیکن ان کی وہ حدیثیں نہ لکھو جو بحوالہ ابواسحاق از حارث ہیں۔(۱۸)

یہ اقتباس بھی امام صاحب کی اصول حدیث کے فن میں دلچسپی اور نظر پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح حافظ ذہبی نے ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان کی تعدیل کرتے ہوئے دیگر ائمہ کے کلمات تعدیل کے ساتھ امام صاحب کے کلمات کو بایں الفاظ نقل کیا:

رأیت ربیعة وابا الزناد و ابو الزناد افقه۔(۱۹)	میں نے ربیعہ اور ابوالزناد دونوں کو دیکھا لیکن ابوالزناد زیادہ فقیہ ہیں۔

اسی طرح امام جعفر صادق کے بارے میں فرمایا:

"عن ابی حنیفة مارأیت افقه من جعفر بن محمد۔(۲۰)

امام صاحب نے اس فن کو احادیث سے مسائل اخذ کرتے ہوئے کس عمدگی اور گہرائی سے

استعمال کیا اس کا اندازہ امام ابن الہمام کے نقل کردہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے:

''امام اعظم بغداد تشریف لائے وہاں کے ارباب روایت نے اس مسئلہ میں کہ چھوہارے کی بیع کھجور سے جائز ہے۔ یہ کہہ کر امام صاحب کے خلاف آواز اٹھائی کہ یہ مسئلہ حدیث کے خلاف ہے۔ ارباب روایت نے امام صاحب سے دریافت کیا کہ بتائیے آپ کھجور کی بیع چھوہارے سے کیسے جائز بتاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ بیع دو حال سے خالی نہیں کہ چھوہارے، کھجور ہیں یا نہیں اگر ہیں تو بیع جائز ہے۔ التمر بالتمر حدیث میں اس کی اجازت ہے اور اگر کھجور نہیں تو پھر بھی اس کی بیع جائز ہے، کیونکہ حدیث میں ہے اذا اختلف النوعان فبیعوا کیف شئتم۔ لوگوں نے جواباً حدیث سعد پیش کی جس میں اس بیع سے منع کیا گیا ہے، امام اعظم نے فرمایا: اس حدیث کا مدار زید بن عیاش پر ہے اور اس کی حدیث قابل پذیرائی نہیں''۔ (۲۱)

زید بن عیاش کو امام ابوحنیفہ نے مجہول کہا ہے۔ (۲۲)

چند مزید راویوں کے بارے میں امام اعظمؒ کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

۱ - طلق بن حبیب کان یری القدر۔

۲ - لعن اللہ عمرو بن بید فانہ فتح للناس بابا الی علم الکلام۔

۳- قاتل اللہ جھم بن صفوان و مقاتل بن سلیمان ھذا افرط فی النفی و ھذا افرط فی التشبیہ۔

۴ - ان ھذا اعلم الناس بحدیث عمرو بن دینار فاجتمعوا علی فحدثتھم۔

امام صاحب کے اس فن کے امام ہونے کی بات کو ان جملوں پر ختم کرتا ہوں:

اعلم الامام ابا حنیفۃ قد قیل قولہ فی الجرح و التعدیل و تلقوہ عنہ علماء ھذا الفن و عملوا بہ۔ (۲۴)

ناسخ و منسوخ کے عارف: ناسخ و منسوخ کی معرفت احادیث احکام میں اہم اور بنیادی ہے۔ کیونکہ اگر وہ ایک جیسی نصوص (احادیث) آجائیں اور ان میں جمع تطبیق اور ترجیح نہ دی جاسکے تو یقیناً ایک منسوخ ہوگئی۔ امام اعظمؒ ایک مجتہد تھے اس لیے احادیث میں ناسخ و منسوخ کی پہچان بدرجہ کمال

ان کو حاصل تھی۔ علامہ صالح دمشقی لکھتے ہیں:

روی القاضی ابو عبداللہ الصیمری عن الحسن بن صالح قال کان الامام ابو حنیفة رضی اللہ عنہ شدید الفحص عن الناسخ من الحدیث والمنسوخ فیعمل به اذا ثبت عنده عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وکان عارفا بحدیث اهل الکوفة شدید الاتباع لما کان علیه الناس ببلده وکان حافظا لفعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الاخیر الذی قبض علیه مما وصل الی اهل بلده۔ (۲۵)

قاضی ابوعبداللہ الصیمری نے حسن بن صالح سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ابوحنیفہ احادیث میں ناسخ ومنسوخ کی سخت تفتیش کرتے تھے، پس جب کسی حدیث کا نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہونا ثابت ہوجاتا (اور وہ ناسخ ہوتی) تو آپ اس پر عمل کرتے اور آپ اہل کوفہ کی احادیث کو پہچانتے تھے اور آپ کے شہر کے لوگ جن احادیث پر عمل پیرا ہوتے، آپ ان احادیث کی شدت سے اتباع کرتے اور آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری افعال جن پر آپ کی وفات ہوئی اور وہ افعال اہل کوفہ تک پہنچے تھے ان کے حافظ تھے۔

امام ابوحنیفہؒ نے نماز میں ترک رفع الیدین والی روایات کو اسی قاعدہ کی بنا پر اختیار کیا۔

مجہول راویوں کی روایت: امام ابوحنیفہ کے دور میں راویوں پر عدالت کا غلبہ تھا۔ اس لیے آپ نے بعض ایسے راویوں کی روایات کو بھی قبول کیا جو مجہول تھے۔ چونکہ راویوں کی تضعیف وتوثیق اجتہادی معاملہ ہے، اس لیے امام صاحب نے خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم کے تحت ایسے راویوں کی روایات کو قبول کیا۔ امام صاحب خود امام جرح وتعدیل ہیں تو آپ نے جب ان کی روایت کو قبول کیا تو جہالت ختم ہوگئی۔ محمد بن ابراہیم الوزیر لکھتے ہیں۔ (۲۶)

امام اعظم کا مذہب یہ ہے کہ روایت مجہول بھی قابل قبول ہے اور یہ صرف امام اعظم کا نہیں بلکہ اور بھی بہت سے اکابر کا مسلک ہے۔

محمد بن ابراہیم الوزیر نے یہ وضاحت کی کہ ایسی روایات بطور شواہد وتوابع لی گئی ہیں۔ اس طرح کے راویوں سے بخاری ومسلم میں بھی روایات لی گئی ہیں اور یہ امام اعظم کے امام فن ہونے کی دلیل ہے۔ (۲۷)

فقیہ راوی کی روایت کو ترجیح: امام اعظم روایات میں ترجیح کے لیے راوی کی فقاہت کو پیش نظر رکھتے۔ اگر دو روایات صحیح ہوں تو امام صاحب اس روایت کو ترجیح دیتے جس کے راوی فقیہ ہوں۔ امام اعظم اور امام اوزاعی دار الحناطین (گندم کی منڈی) میں جمع ہوئے تو اس میں امام اوزاعی نے اپنی روایت کی وجہ ترجیح سند عالی بتائی تو امام اعظم نے فرمایا: **کان حماد بن ابی سلیمان افقه من الزهری و کان ابراهیم افقه من سالم۔**(۲۸)

گویا امام اعظم کے نزدیک راویوں میں ترجیح کا معیار فقاہت ہے۔

یعنی عدم رفع کی روایت کے راوی فقاہت کی وجہ سے رفع یدین کے راویوں پر برتری رکھتے ہیں جیسا کہ امام ابوحنیفہ نے امام اوزاعی کو جواب دیا۔ امام اعظمؒ کے اس طرز ترجیح کا اندازہ امام محمد کے اس بیان سے بھی لگایا جا سکتا ہے:

> ''اہل مدینہ کا مسلک یہ ہے کہ عیدین کی پہلی رکعت میں سات اور دوسری میں پانچ تکبیریں ہیں، لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک دونوں رکعتوں میں کل نو تکبیریں ہیں، پانچ پہلی میں اور چار دوسری میں، جن میں تکبیر تحریمہ اور رکوع کی دو تکبیریں بھی شامل ہیں پھر فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کا بھی وہی مسلک ہے جو اہل مدینہ کا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اہل مدینہ نے ان کے علاوہ کسی اور سے روایت کی ہو۔ جو رائے امام ابوحنیفہ کی ہے وہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی ہے، جو حضرت ابوہریرہؓ کے مقابلہ میں اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کے قول کو قبول کیا جائے''۔(۲۹)

روایت بالمعنی کا جائز نہ ہونا: روایت بالمعنی سے مراد ہے کہ راوی روایت کے اصل الفاظ کی بجائے معانی کو اپنے الفاظ میں بیان کر دے۔(۳۰)

محدثین و اصولیین کے روایت بالمعنی کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، علامہ آمدی لکھتے ہیں:

والذی علیه اتفاق الشافعی و مالک و ابی حنیفة و احمد بن حنبل و الحسن البصری و اکثر الائمة انه یحرم علی	جس رائے پر شافعی، مالک، ابوحنیفہ، احمد بن حنبل، حسن بصری اور اکثر ائمہ کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ ناقل اگر الفاظ کے مدلولات اور مواقع کے اختلاف

الناقل اذا کان غیر عارف بدلالات الالفاظ و اختلاف مواقعها۔ (۳۱)

کی معرفت نہیں رکھتا تو اس کے لیے روایت بالمعنی حرام ہے۔

مگر ملا علی قاری نے امام صاحب کا جو اصول بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روایت بالمعنی کسی صورت جائز نہیں۔

قال ابو حنیفة: لا ینبغی للرجل ان یحدث من الحدیث الا ما یحفظه من یوم سمعه الی یوم یحدث به، حاصله انه لم یجز الروایة بالمعنی، ولو کان مرادفاً للمبنی خلافا للجمهور من المحدثین۔ (۳۲)

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں: کسی راوی کے لیے حدیث کا بیان کرنا مناسب نہیں جب تک اسے سماع کے دن سے روایت کے دن تک مسلسل وہ حدیث یاد نہ ہو (اس سے ملا علی قاری نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ) پس روایت بالمعنی کو امام ابوحنیفہ جائز نہیں کہتے چاہے وہ مترادف الفاظ ہی کیوں نہ ہوں اور یہ جمہور محدثین کی رائے کے برعکس ہے۔

مرسل روایت کی قبولیت: مرسل کے بارے میں اہل علم کا اختلاف معروف ومعلوم ہے۔ مراسیل کو امام ابوحنیفہ قبول کرتے تھے (۳۳) لیکن ابوزہرہ نے قبولیت مراسیل کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھا کہ امام صاحب صرف ان لوگوں کی مراسیل قبول کرتے تھے جن سے آشنا ہوتے تھے، ان کے طریقہ سے متاثر تھے جو آپ کے ہاں قابل اعتماد تھے اور ان کی روایات میں شبہہ کی کوئی مجال نہ تھی۔ ابراہیم نخعی کو دیکھیے امام صاحب کے استاذ الاستاذ ہیں، وہ ان کے طرز فکر ونظر سے متاثر ہیں، ان کی فقہ کے راوی اور ان کی مخالف وموافق روایات پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔ حسن بصری عراق کے مشہور واعظ تھے اور ابراہیم کی طرح قابل اعتماد! الغرض وہ تمام راویان حدیث جن کی مراسیل آپ کے پیش نظر رہیں وہ تابعین یا تبع تابعین خود بھی قابل اعتماد ہوں اور ضعیف اور نا قابل اعتماد راویوں سے روایت کرتے ہوں۔ گویا امام ابوزہرہ کی تحقیق کے مطابق وہ علی الاطلاق مراسیل سے احتجاج کے قائل نہ تھے۔ (۳۴)

امام ابوزہرہ کی رائے وقیع معلوم ہوتی ہے کیونکہ امام صاحب کے شاگرد رشید امام محمد بھی مرسل کے بارے میں جو رائے رکھتے ہیں ایسی ہی ہے۔ ڈاکٹر محمد الدسوقی لکھتے ہیں:

''خلاصہ یہ ہے کہ مرسل امام محمد کے نزدیک قبولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ بشرطیکہ اس کا راوی ثقہ ہو اور یہ حدیث کتاب اللہ، حدیث مشہور، متواتر یا عام تشریعی قاعدے کے خلاف نہ ہو''۔(۳۵)

امام ابوحنیفہ اور خبر واحد: خبر واحد کے قبول ورد پر اصولیین کے ہاں طویل بحثیں ہیں، ذیل میں امام ابوحنیفہ کی فکر کو امام ابوزہرہ کی کتاب کے مختلف حصوں سے پیش کیا جا رہا ہے۔

امام ابوحنیفہ اولین فقیہ تھے، جنہوں نے اخبار آحاد کو لائق احتجاج قرار دیا۔ اگر اپنی رائے کو مخالف حدیث پایا تو اس کو احادیث آحاد کے تقاضوں کے مطابق کر لیا، قاری کے سامنے امام ابو یوسف اور امام محمد کی دونوں کتاب الآثار موجود ہیں، ان پر طائرانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کو اخبار آحاد سے کتنی وابستگی تھی اور کس طرح وہ اپنی فقہ کو ان پر مبنی قرار دیتے تھے۔ ان کی نصوص کو اخذ کرتے اور ان سے علل الاحکام کا استخراج کرتے، پھر ان پر اپنا قیاس استوار فرماتے جس میں مصلحت عامہ ہمیشہ ملحوظ رہتی۔ امام ابوحنیفہ اپنے تلامذہ کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے جس کو انہوں نے بھی قبول کیا۔ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

''اکثر اہل حدیث امام ابوحنیفہ کو مورد طعن بناتے ہیں کہ وہ ثقہ راویوں کی اخبار آحاد کو ترک کر دیتے تھے، دراصل اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اخبار آحاد کو اپنے یہاں جمع کردہ احادیث اور معانی قرآن پر پیش کرتے تھے، ان احادیث کو جو اپنے معنی میں منفرد ہوتی اسے ترک کر دیتے اور اس کا نام شاذ رکھتے''۔(۳۶)

اس مسئلہ میں علامہ زاہد الکوثری نے امام اعظم کے اصول وقواعد سے جو نکات اخذ کیے، ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ اخبار آحاد کو کتاب اللہ کے عمومات پر پیش کیا جائے گا، اگر خبر واحد کتاب اللہ کے عموم یا ظاہر کے مخالف ہے تو اس کو ترک کر کے کتاب اللہ کے عموم وظاہر پر عمل کیا جائے۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جب دو دلیلیں ہوں تو ان میں سے قوی دلیل کو لیا جاتا ہے۔ کتاب اللہ قطعی الثبوت ہے اور اس کا عموم وظاہر قطعی الدلالۃ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ خبر واحد کے مقابلہ میں زیادہ قوی دلیل ہے۔ ۲۔ ان اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ خبر واحد کسی سنت مشہورہ کے معارض نہ ہو، یہ سنت مشہورہ قولی ہو یا فعلی۔

یہاں بھی مخالفت وتعارض کی صورت میں اقویٰ دلیل کو اختیار کیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ خبر واحد کے مقابلہ میں سنت مشہورہ ثبوت کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے۔ ۳-خبر واحد اپنی ہی طرح کی کسی خبر واحد کے معارض نہ ہو۔اس صورت میں ایک کو راجح قرار دیا جائے گا۔ ۴-خبر واحد کا راوی اپنی ہی روایت کے خلاف فتویٰ نہ دے اگر ایسا ہو تو روایت کو ترک کر کے فتوی پر عمل کیا جائے گا۔ ۵-حدود وعقوبات کے سلسلہ میں اگر اخبار آحاد آپس میں متعارض ہوں تو اخف کو اختیار کیا جائے گا۔ ۶-اس خبر واحد کو اختیار کیا جائے گا جس کی جانب آثار زیادہ ہوں۔ ۷-خبر واحد پر عمل کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ صحابہ اور تابعین کے عمل متواتر کے خلاف نہ ہو۔ ۸-خبر واحد کے سلسلہ میں ایک اصول یہ ہے کہ سلف میں سے اس پر کسی کا طعن منقول نہ ہو۔(۳۷)

یہ نکات علامہ کوثری نے علامہ محمد بن یوسف الصالحی کی عقود الجمان سے لیے ہیں۔اس کے بعد علامہ کوثری لکھتے ہیں: ان قواعد کی بنا پر امام ابوحنیفہ نے بہت سی اخبار آحاد پر عمل نہیں کیا۔اس کا سبب مخالفت حدیث نہیں بلکہ اجتہاد ہے۔

طرق تحمل روایت: سماع اور قرأت محدثین کے ہاں دونوں جائز ہیں۔اس میں ترجیح کس کو حاصل ہے، مکی بن ابراہیم کہتے ہیں:

”کان ابن جریج و عثمان بن الاسود و حنظلة بن ابی سفیان و مالک و سفیان الثوری و ابو حنیفة و هشام و غیرهم یقولون : قراءتک علی العالم خیر من قراءة العالم علیک“۔(۳۸)

یعنی عالم کے سامنے روایات کا پڑھنا، عالم کی قراءت سے بہتر ہے۔اسی طرح ابن الصلاح کا کہنا ہے:

”فنقل عن ابی حنیفة و ابن ابی ذئب و غیرهما ترجیح القراءة علی الشیخ علی السماع من لفظه“۔(۳۹)

امام ابوحنیفہ اور ابن ابی ذئب اور دیگر نے قراءۃ علی الشیخ کو سماع پر ترجیح دی ہے۔

اسی طرح مناولہ کے بارے میں آپ کی رائے اس طرح بیان کی گئی:

وهذه المناولة کالسماع فی القوة عند یعنی امام زہری، شعبی، ابراہیم، ربیعہ، علقمہ اور

الزهری والشعبی وابراهیم و ربیعة وعلقمة ومالک والصحیح انها منحطة عن السماع والقراءة وهو قول الثوری وابی حنیفة والشافعی۔(۴۰)

مالک کی رائے یہ ہے کہ مناولہ قوت میں سماع کے برابر ہے مگر صحیح یہ ہے کہ اس کا مقام کم تر ہے اور یہ رائے ثوری، ابوحنیفہ اور امام شافعی کی ہے۔

درایت الحدیث: امام اعظمؒ نے حدیث کی سند کے اصول وضوابط ہی پر اپنی آراء وافکار پیش نہیں کیے بلکہ درایت الحدیث کے فن کی بنیاد بھی رکھی۔ مولانا شبلی نعمانی کے بقول:

''فن حدیث میں سب سے بڑا کام امام ابوحنیفہ نے یہ کیا کہ روایت کے اصول قائم کیے اور ان کو احادیث کی تحقیق وتنقید میں برتا۔ یہ عزت صرف امام ابوحنیفہ کو حاصل ہے کہ جب اس فن کا نام ونشان بھی نہ تھا اس وقت ان کی نگاہ باریک نکتوں تک پہنچی۔ بے شبہ صحابہ کی تاریخ میں جستہ جستہ اصول درایت کے آثار نظر آتے ہیں اور درحقیقت وہی امام ابوحنیفہ کے لیے دلیل راہ بنے''۔(۴۱)

حوالہ جات رحواشی

(۱) المنہاج السنۃ النبویۃ، ج ۴، ص ۱۱۴۔ (۲) تدریب الراوی، ص ۸۔ (۳) الرفع والتکمیل، ص ۷۰۔ (۴) نسفی، عبداللہ بن احمد، کشف الاسرار شرح منارالانوار، مصر، ج ۱، ص ۵۔ (۵) سوانح بے بہائے امام اعظم ابوحنیفہ از شاہ ابوالحسن زید فاروقی، فاروقی، شاہ ابوالحسن زید، سوانح بے بہائے امام اعظم ابوحنیفہ، شرق پور شریف، ۱۹۹۴ء، ایضاً، ص ۳۶۷۔ (۶) شعرانی، عبدالوہاب، المیزان، ج ۱، ص ۵۵۔ (۷) معلومات کے لیے ملاحظہ فرمائیں الطباخ، علامہ راغب، تاریخ افکار وعلوم اسلامی، مترجم مولانا افتخار احمد بلخی، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۹ء، ج ۲، ص ۴۷۔۵۰۔ (۸) ایضاً، ص ۵۳۔ (۹) الموفق بن احمد المکی، مناقب الامام الاعظم، مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ، ۱۴۰۷ھ، ج ۱، ص ۱۹۷، امام ابن حجر نے بھی امام موصوف کی کڑی شرطوں کا ذکر کیا (لسان المیزان، ج ۵، ص ۳۱)۔ (۱۰) تحفۃ الاحوذی، ج ۲، ص ۱۵۔ (۱۱) عبدالقیوم، پروفیسر مقالات پروفیسر عبدالقیوم، مرتبین ڈاکٹر محمود الحسن عارف، میجر زبیر قیوم، المکتبۃ

السّلفیہ، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۷۔ (۱۲) تہذیب التہذیب، ج ۱۰، ص ۴۵۱۔ (۱۳) ابن حزم، الاحکام فی اصول الاحکام، ۱۳۴۵، ج ۴، ص ۵۴۰۔ (۱۴) اعلام الموقعین، ج ۱، ص ۷۷۔ (۱۵) الہیثمی، ابن حجر، الخیرات الحسان، مکتبۃ الخیریہ، ۱۳۰۴ھ، ص ۸۷۔ (۱۶) السخاوی، محمد بن عبدالرحمٰن، الاعلان بالتوبیخ، مترجم ڈاکٹر سید محمد یوسف، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۳۵۱۔ (۱۷) ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ، جامع الترمذی، بیت الافکار الدولیۃ الریاض، کتاب العلل، ص ۱۰۹۶۔ (۱۸) الجواہر المضیئۃ، ج ۱، ص ۳۰۔ (۱۹) تذکرۃ الحفاظ۔ (۲۰) تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۱۶۶۔ (۲۱) فتح القدیر، ص ۱۵۱۔ (۲۲) تہذیب التہذیب، ج ۳، ص ۴۲۳۔ (۲۳) الداری، تقی الدین بن عبدالقادر، الطبقات السنیۃ فی تراجم الحنفیۃ، تحقیق دکتور عبدالفتاح محمد الحلو، دارالرفاعی للنشر والطباعۃ والتوزیع، ۱۹۸۳ء، ج ۱، ص ۹۷۔ (۲۴) القرشی، عبدالقادر، جواہر المضیئۃ، ج ۱، ص ۳۰۔ (۲۵) عقود الجمان، ص ۱۷۶۔ (۲۶) الروض الباسم، ج ۱، ص ۱۵۸۔ (۲۷) ایضاً، ص ۱۶۹۔ (۲۸) مناقب الامام الاعظم ابی حنیفۃ للموفق، ج ۱، ص ۱۳۱۔ (۲۹) الدسوقی، ڈاکٹر محمد، امام محمد بن حسن شیبانی اور ان کی فقہی خدمات، مترجمین حافظ شبیر احمد جامعی، ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی۔ (۳۰) اصغانی، محمد بن اسماعیل، توضیح الافکار، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۶۶ھ، ج ۲، ص ۳۹۲۔ (۳۱) الآمدی، علی بن محمد السالم، الاحکام فی اصول الاحکام، مکتبہ صبیح، ۱۳۸۷ھ، ج ۲، ص ۸۶۔ (۳۲) ملا علی قاری، شرح الملا علی القاری علی مسند الامام الاعظم، تحقیق مشتاق احمد حنفی، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ص ۷۔ (۳۳) تقریب الراوی، ص ۱۰۳، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، ج ۱، ص ۳۴۳، التمہید، ج ۱، ص ۴۰۔ (۳۴) ابوزہرہ حیات امام ابوحنیفہ، مترجم غلام احمد حریری، ملک سنز، فیصل آباد، ص ۵۲۳۔ (۳۵) امام احمد بن حسن شیبانی اور ان کی فقہی خدمات، ص ۲۷۸۔ (۳۶) حیات ابوحنیفہ، ص ۴۷۶۔ ۵۱۸ ملاحظہ فرمائیں۔ (۳۷) الکوثری، زاہد، تانیب الخطیب، المکتبۃ الازہریہ للتراث القاہرہ، ۱۹۹۸ء، ص ۲۴۲۔ (۳۸) تدریب الراوی، ص ۲۴۴۔ (۳۹) مقدمہ، ص ۵۲۔ (۴۰) تدریب الراوی، ص ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ (۴۱) شبلی نعمانی، مولانا، سیرۃ النعمان، اسلامی اکادمی اردو بازار، لاہور، ص ۱۸۱۔ ۱۸۲۔

تاریخِ نوائط۔ بعض مسائل

ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

معارف اکتوبر ۲۰۱۵ء کے شمارے میں ایک نائطی بزرگ ''حضرت علامہ فخر الدین مہکری نائطی'' پر ڈاکٹر راہی فدائی صاحب کا مضمون شائع ہوا تھا۔ فاضل مضمون نگار نے شروع ہی میں قوم نوائط کے بارے میں ایک عربی عبارت نقل کی تھی اور حوالہ تاریخ طبری کا دیا تھا۔ مذکورہ شمارے کی ورق گردانی کے دوران راقم کی نگاہ اتفاقاً اس اقتباس پر پڑی اور امام طبری کا نام دیکھ کر ٹھہر گئی۔ عبارت پڑھی تو حیران رہ گیا کہ ایک ایسی تحریر جو بظاہر دسویں صدی ہجری یا اس کے بعد کے کسی ہندوستانی مصنف کی لکھی ہوئی ہے امام طبری کی جانب کیسے منسوب ہوگئی! اس کی زبان اس عہد کی زبان نہ اس کا اسلوب امام طبری کا اسلوب۔ تاریخی سقم اور قواعد کی بعض فاش غلطیاں اس پر مستزاد!

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری کا شمار تاریخ اسلام کے مشہور اور ممتاز ترین علما میں ہوتا ہے۔ وہ تیسری صدی ہجری میں ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے۔ امام احمد بن حنبل کا انتقال ہوا تو ان کی عمر سترہ برس تھی۔ ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔ قراءات، تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ میں انہیں امامت کا مرتبہ حاصل تھا۔ امام ذہبی (ف ۷۴۸ھ) نے ان کے لیے ''من كبار أئمة الإسلام المعتمدين'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں (۱)۔ فقہ میں ان کا شمار ائمہ اربعہ کی طرح فقہائے مجتہدین میں ہوتا ہے۔ ان کے متبعین خود کو جریری کہتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض دوسرے ائمہ مثلاً امام اوزاعی (ف ۱۵۷ھ)، امام سفیان ثوری (ف ۱۶۱ھ) اور امام ابوثور (ف ۲۴۰ھ) کی طرح ان کا فقہی مسلک بھی زیادہ دنوں تک رائج نہ رہ سکا۔ امام طبری نے ان سارے فنون میں جلیل القدر تصنیفات یادگار چھوڑی تھیں

ریاض، سعودی عرب۔

مگر جو محفوظ رہ سکیں ان میں سب سے اہم ان کی ضخیم اور مشہور زمانہ کتابیں تفسیر طبری (جامع البیان عن تاویل آی القرآن) اور تاریخ طبری (تاریخ الامم والملوک) ہیں جو اپنے عہد تصنیف سے آج تک سارے علما و محققین کا بنیادی مرجع ہیں۔

ہر بڑے مصنف کی طرح امام طبری کا بھی اپنا ایک خاص اسلوب ہے جو ان کی کتابوں میں نمایاں ہے۔ دو ہم عصر یا قریب العہد مصنّفین کی تحریروں میں اشتباہ ہوسکتا ہے، اگرچہ دیر سویر اس کا بھی انکشاف ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن اگر ان کے درمیان صدیوں کا زمانی فاصلہ حائل ہو تو یہ تفاوت اتنا واضح ہوتا ہے کہ امتیاز کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ بالفرض اگر آج ہمارے سامنے امام طبری کی کوئی تصنیف موجود نہ ہوتی تب بھی قوم نوائط کے بارے میں منقولہ عبارت کی نسبت امام طبری کی جانب کسی طور قابل قبول نہیں ہوسکتی تھی کہ تیسری صدی تو کجا، اسے آٹھویں صدی کی تحریر قرار دینا بھی آسان نہیں۔

مزید حیرت اس پر ہوئی کہ فاضل مضمون نگار نے براہ راست اصل ماخذ یعنی تاریخ طبری کا حوالہ نہیں دیا، بلکہ نواب عزیز جنگ بہادر کی تاریخ النوائط پر اعتماد کیا۔ اور نواب صاحب نے بھی یہ عبارت تاریخ طبری کے بجائے ایک قلمی کتاب ''گلستان نسب'' سے نقل کی۔ ڈاکٹر راہی فدائی صاحب نے اس بظاہر غیر علمی طریق کار کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی کہ تاریخ طبری جیسی معروف، متداول اور مطبوعہ کتاب (جس کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے) کو چھوڑ کر ایک ثانوی ماخذ سے نقل در نقل کا سہارا کیوں لیا؟ یوں یہ اقتباس اور بھی مشکوک نظر آیا۔

یہ بات تو میرے علم میں تھی کہ قوم نوائط کا سلسلۂ نسب قریش سے ملتا ہے، لیکن اس قوم کی تاریخ اور لٹریچر میرے مطالعے کا موضوع کبھی نہیں رہا، اس لیے تفصیلات سے واقفیت نہ تھی۔ مخدوم مہائمی پر مرحوم مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی صاحب کی کتاب دیکھے ہوئے بھی ایک عرصہ گذر چکا، یہ کتاب غالباً ۱۹۷۲ء میں چھپی تھی اور ۱۹۸۲ء میں میرے قلم سے اس کا تعارف عربی میں مجلہ ثقافۃ الہند میں اور اردو میں رسالہ ''ہندوستانی زبان'' میں شائع ہوا تھا (۲)۔ یہاں سعودی عرب میں اردو فارسی کے عام مآخذ دستیاب نہیں تو تاریخ النوائط کہاں ملتی، لیکن اقتباس کی نسبت چونکہ تاریخ طبری کی جانب تھی اور اس کا محققانہ اڈیشن مطبوعہ مصر میرے پاس موجود تھا (بعد میں یورپ کا اڈیشن بھی مل

گیا) اس لیے اس یقین کے باوجود کہ یہ عبارت تاریخ طبری کی نہیں ہوسکتی، اسے مختلف طریقوں سے تلاش کرنے کی کوشش کی، کہ شاید اس کا کوئی ٹکڑا ہاتھ آجائے، یا عبارت نہ سہی اصل مضمون ہی مل جائے۔ یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی تو خیال ہوا کہ ممکن ہے بعد کی تاریخوں میں خصوصاً جن کا اعتماد زیادہ تر تاریخ طبری پر رہا ہے، جیسے ابن الاثیر کی ''الکامل فی التاریخ'' اور ابن کثیر کی ''البدایۃ والنہایۃ''، ان میں ایسا کوئی ذکر ہو۔ مگر یہاں بھی ناکامی ہوئی، نہ یہ مضمون ملا نہ نوائط نام کے کسی قبیلے یا جماعت کا ذکر۔ اب یہ جستجو ہوئی کہ یہ عبارت سب سے پہلے کس شخص نے امام طبری کی جانب منسوب کی؟ جو مآخذ میرے پاس موجود تھے مثلاً غلام علی آزاد بلگرامی (ف ۱۲۰۰ھ) کی سبحۃ المرجان، نواب صدیق حسن خان (ف ۱۳۰۷ھ) کی ابجد العلوم اور مولانا عبدالحی حسنی (ف ۱۳۴۱ھ) کی نزہۃ الخواطر، انہیں دیکھا، اس سوال کا جواب تو نہ مل سکا، تاہم کچھ باتیں سامنے آئیں جن کی روشنی میں ایک مختصر نوٹ لکھا جو نومبر ۲۰۱۵ء کے شمارے میں معارف کی ڈاک میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر راہی فدائی صاحب نے میری معروضات کا جواب دسمبر کے شمارے میں دیا، اور ستم ظریفی یہ ہے کہ یہاں مآخذ کی کمی بلکہ نایابی کی وجہ سے مجھے اپنی تنگ دامانی اور بے بسی کا رنج تھا اور دوسری طرف میں نے اپنے خط میں جو دو چار مآخذ کے حوالے دیے تھے ڈاکٹر راہی صاحب نے اسے بھی ''وسعت مطالعہ کا اظہار'' قرار دیا اور غالباً اسی وجہ سے کہ مبادا یہ تہمت ان پر لگ جائے، انہوں نے اپنے طویل جوابی مراسلے میں ''تاریخ النوائط'' کے سوا کوئی اور کتاب دیکھنے سے مکمل طور پر احتراز کیا۔

تاریخ طبری کی جانب منسوب عبارت پر جو بحث میں نے چھیڑی تھی اس کے جواب میں انہوں نے یہ اطلاع دی کہ وہ اس سے قبل چھڑ چکی ہے اور اس کا جواب بھی دیا جاچکا ہے، اور اس سلسلے میں انہوں نے تاریخ النوائط پر علامہ شبلی کی تقریظ مکمل نقل کردی۔ یہ تو آیندہ معلوم ہوگا کہ یہ تقریظ میرے اعتراض کا جواب ہے، جیسا کہ موصوف کو خوش گمانی ہے یا اس سے میری باتوں کی تصدیق ہوتی ہے، بہرحال اس تقریظ کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔ اگر تاریخ النوائط میرے پاس ہوتی یا مجھے اس تقریظ کی اطلاع ہوتی تو میرا کام آسان ہوجاتا اور اسی کو اس بحث کی بنیاد بناتا۔

اس عبارت کو تاریخ طبری کا حصہ قرار دینے کے لیے فدائی صاحب نے بعض امکانات کا

بھی ذکر کیا ہے جن پر گفتگو آگے آئے گی، لیکن ان کا جوابی مراسلہ تو ایک اور شگوفہ کھلا گیا۔ انہوں نے لکھا کہ مولانا باقر آگاہ (ف ۱۲۲۰ھ) نے قبیلۂ نوائط کے جد امجد کا نام ''نایط بن نضر'' بتایا ہے۔ فدائی صاحب نے یہ بات تاریخ النوائط سے نقل کی ہے اور اس کی صداقت کے لیے غالباً ان کے نزدیک اتنا کافی ہے ورنہ ''بزرگان سلف پر بے جا انگشت نمائی'' لازم آئے گی۔ راقم مولانا باقر آگاہ کے نام اور ان کے بعض ادبی کارناموں سے آشنا تھا لیکن ان کے اس حیرت انگیز علمی اکتشاف کی خبر پہلی بار ڈاکٹر راہی صاحب کے مراسلے میں پڑھی تو یقین نہ آیا مگر مشکل یہ ہوئی کہ معارف کا یہ شمارہ جب موصول ہوا تو میں تعطیلات گزار کر وطن سے ریاض واپس آچکا تھا، اور اس موضوع کے ضروری مآخذ سے جو وہاں میری دسترس میں تھے استفادہ کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ نومبر کے اواخر میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں میری ملاقات عزیز اور فاضل دوست مولانا فیصل ندوی بھٹکلی سے ہوئی اور طبری کی جانب منسوب عبارت اور گلستان نسب کا ذکر آیا تو انہوں نے بتایا کہ تاریخ النوائط ان کے پاس موجود ہے اور گلستان نسب کا عکس بھی، لیکن اس وقت دونوں کتابیں اپنی جگہ پر نہ ہونے کی وجہ سے وہ مجھے دکھا نہ سکے۔ ڈاکٹر راہی صاحب کے جوابی مراسلے کے بعد ضرورت ہوئی تو میں نے ان کی جانب رجوع کیا۔ چنانچہ انہوں نے گلستان نسب کے تین صفحات کے عکس بھجوائے۔ یہ صفحات دیکھ کر تو میں دم بخود رہ گیا۔ نو بہ نو شگوفوں کی جو بہار یہاں آئی ہوئی تھی اس کے آگے طبری کے نام سے منسوب عبارت کے بارے میں اگر آتش کے بقول یہ کہا جائے کہ ''ادنی یہ شگوفہ ہے نسیم سحری کا'' تو بیجا نہ ہوگا۔

فیصل بھٹکلی صاحب نے میری درخواست پر باقر آگاہ کی اصل عبارت بھی بھجوائی اور یہ بتایا کہ ان کی کتاب النفحۃ العنبریۃ کا قلمی نسخہ آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں محفوظ ہے، پھر عزیزی ڈاکٹر محمد ثاقب ندوی نے تاریخ النوائط طبع اول سے متعلقہ صفحات کے عکس بھیجے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں صاحبوں کو جزائے خیر دے۔

ڈاکٹر فدائی صاحب کے جوابی مراسلے کی روشنی میں طبری کی جانب منسوب عبارت پر گفتگو اب کچھ تفصیل چاہتی تھی اور معارف کی ڈاک اس کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ ان کے جواب نے جو نیا گل کھلایا تھا یعنی قبیلۂ نوائط کے جد امجد نائطۃ بن نضر کا قضیہ وہ میرے نزدیک اس مبینہ عبارت

سے زیادہ اہم تھا اور اس کی تحقیق ضروری تھی۔ گلستان نسب کے مذکورہ تین صفحات میں ایک اور جدامجد کا بھی ذکر تھا۔ اس موقع پر ان پر بھی بحث ضروری معلوم ہوئی۔ مگر میری روزمرہ کی مصروفیت اور بعض دوسرے اسباب کی وجہ سے تاخیر پر تاخیر ہوتی گئی۔ مجھے افسوس ہے کہ ڈاکٹر راہی فدائی صاحب کو میرے جواب کا اتنا طویل انتظار کرنا پڑا۔ بہرحال طبری کی عبارت پر بحث بعد میں کرتے ہیں، پہلے مولانا باقر آگاہ کے یہ جدامجد۔

(۱) نائطۃ بن نضر : مولانا باقر آگاہ (ف ۱۲۲۰ھ) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا جو ان کے نعتیہ مجموعے "النفحۃ العنبریۃ فی مدیحۃ خیر البریۃ" (۳) میں شامل ہے۔ اس کا ایک شعر ہے:

طاولت بي رهط ذبيان بنو نائط مذ صرت فيهم نابغا

یعنی جب سے بنو نائط میں میرا ظہور ہوا وہ قبیلۂ ذبیان کے مدمقابل آ گئے اور ان پر اپنی برتری کا دعویٰ کرنے لگے۔

قبیلۂ ذبیان میں بہت سے شاعر گزرے ہیں لیکن یہاں اشارہ جاہلی دور کے ممتاز شاعر نابغہ ذبیانی کی جانب ہے۔ باقر آگاہ نے اپنے اشعار کی شرح بھی لکھی ہے۔ مندرجہ بالا شعر پر لکھتے ہیں:

نائط أيضا قبيلة على حد ما مر في ذبيان، و تجمع على نوائط، و حذفت التاء بالترخيم، وهذا جائز بالاتفاق، ونائطة جد القبيلة ابن نضر بن كنانة وبقية النسب الشريف معروفة۔	ذبیان کی طرح نائط بھی ایک قبیلہ ہے۔ اس کی جمع نوائط ہے، اس کی تاء ترخیم کی وجہ سے حذف ہوگئی ہے اور یہ بالاتفاق جائز ہے۔ قبیلے کے جداعلی نائطۃ نضر بن کنانہ کے بیٹے تھے، باقی نسب شریف معروف ہے۔

اس کے بعد حجاج بن یوسف کے دور میں مدینہ منورہ سے اس قوم کی ہجرت کا ذکر کرتے ہوئے دوبارہ لکھتے ہیں:

اعلم أن النائطة قوم من قريش يجتمعون به صلى الله عليه وسلم	نائطہ قریش کی ایک جماعت ہے جس کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

فی نضر بن کنانۃ۔(۴) نضر بن کنانہ میں جا کر ملتا ہے۔

ان اقتباسات سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔قوم نوائط کے جد امجد کا نام نائطہ ہے۔شعر میں ضرورت شعری کی وجہ سے آخری حرف حذف کر کے ''نائط'' کہا ہے۔ڈاکٹر راہی فدائی نے اپنے مراسلے میں ''تاریخ النوائط'' کا جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں باقر آگاہ کے حوالے سے جد قبیلہ کا نام ''نایط بن نضر'' بتایا گیا ہے۔حالانکہ باقر آگاہ کی تشریح سے واضح ہے کہ اصل نام ان کے نزدیک نائطہ ہے۔اوپر جو دوسری عبارت نقل کی گئی ہے اس میں بھی انہوں نے یہی نام لکھا ہے۔شعر میں ''نائط'' ضرورت شعری کی وجہ سے آیا ہے۔

۲۔دوسری بات یہ ہے کہ قبیلے کا نام نائطہ اس کے مورث اعلی کے نام پر ہے۔ایسا نہیں کہ ''نائط کے معنی پیٹھ کی اندرونی رگ کے ہیں جس سے پشت کے اجزا و اعصاب کا اتحاد و استحکام ہوتا ہے۔چونکہ اس قوم میں آپسی اتحاد و اتفاق کا عنصر غالب تھا، اس لیے عربوں نے انہیں قوم نائط کے لقب سے ملقب کیا''۔جیسا کہ ڈاکٹر راہی فدائی صاحب نے اپنے مضمون کے شروع میں ذکر کیا ہے۔ یہاں یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ لفظ نائط کے معنی عربی زبان میں پیٹھ کی اندرونی رگ کے ضرور ہیں مگر یہ کیسے معلوم ہوا کہ پشت کے اجزا و اعصاب کا اتحاد و استحکام بھی اس سے ہوتا ہے؟ نیز یہ لقب کب عربوں نے اس قوم کو دیا اور آپ کو اس کا پتہ کیسے چلا؟ اشتقاق اسماء اور القاب کی کتابوں اور خلیل بن احمد (ف ۱۷۰ھ) کی کتاب العین سے لے کر سید مرتضی زبیدی بلگرامی (ف ۱۲۰۵) کی تاج العروس تک جو عربی لغات ہمارے پاس موجود ہیں، ان میں اس راقم کو تو کہیں اس واقعے کا سراغ نہیں ملا۔

۳۔فدائی صاحب نے اپنے مضمون میں بغیر کسی استثنا یا قید کے لکھا تھا کہ ''قوم نوائط کا سلسلۂ نسب بقول مصنف تاریخ النوائط چند واسطوں سے حضرت جعفر الصادق تک پہنچتا ہے''۔اگر یہ بات درست ہے تو قوم نوائط کا تعلق بنی ہاشم سے ہے۔لیکن مولانا باقر آگاہ یہ فرماتے ہیں کہ ان کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نضر بن کنانہ میں ملتا ہے۔نضر اور رسول اللہؐ کے درمیان بارہ پشتیں ہوتی ہیں۔آپ کا نسب شریف یہ ہے: محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانہ۔

باقر آگاہ کا یہ دعوی درست ہے تو نوائط کا رشتہ بنی ہاشم کیا بنی امیہ سے بھی قائم نہیں ہوتا۔ مشہور قول کے مطابق قریش نضر کی اولاد کو کہتے ہیں لیکن ایک قول یہ بھی ہے اور علما کی ایک جماعت اسی کو صحیح قرار دیتی ہے کہ قریش درحقیقت نضر کے پوتے فہر کی اولاد ہیں۔ اگر یہ بات درست ہو تو باقر آگاہ کے دعوے کی رو سے نوائط قریش سے بھی خارج ہوئے جاتے ہیں۔

یہ باتیں تو خیر ضمنی باتیں ہیں، اصل سوال یہ ہے کہ کیا نضر بن کنانہ کے بیٹوں میں نائطہ نام کا بھی کوئی بیٹا تھا جیسا کہ مولانا باقر آگاہ نے بغیر کسی پس وپیش کے دعوی کیا ہے؟

اسلام سے قبل عربوں کا سرمایۂ افتخار اگر کوئی چیز تھی تو زبان آوری یعنی شاعری اور خطابت کے علاوہ علم الانساب تھا۔ اس علم سے شغف سارے ہی قبائل کو تھا، لیکن خانۂ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے قریش کو جو مذہبی اور معاشرتی سیادت اور مرکزیت حاصل تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ اس فن پر خاص توجہ دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اس اہتمام کا ایک محرک نسلی تفاخر ختم ہوگیا تھا، البتہ دوسرے پرانے اور نئے اسباب موجود تھے۔ قریش میں جو صحابۂ کرامؓ انساب کے ماہر شمار ہوتے تھے ان میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت حکیم بن حزام، حضرت جبیر بن مطعم، حضرت حویطب بن عبدالعزی، حضرت عقیل بن ابی طالب، حضرت ابوالجہم بن حذیفہ اور حضرت مخرمہ بن نوفل رضی اللہ عنہم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ (۵)

دوسری صدی ہجری میں جب تصنیف وتالیف کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا تو انساب عرب پر جامع کتابیں بھی مرتب ہوئیں اور دوسرے قبائل کی طرح قریش کے نسب پر مستقل کتابیں بھی لکھی گئیں۔ ان کتابوں کے علاوہ قریش کا نسب سیرت، تاریخ، تذکرہ، شروح حدیث، اشتقاق الاسماء، مؤتلف ومختلف اور لغت کی کتابوں میں بھی زیر بحث آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب شریف کی وجہ سے اس کی تحقیق وتنقیح کا غایت درجہ اہتمام ہوا۔ اس طرح قریش کا نسب اپنے اتفاقی و اختلافی جزئیات کے ساتھ مکمل طور پر محفوظ اور مدون ہوگیا اور اب کسی کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ اس نسب نامے میں باہر سے کوئی نیا نام داخل کر سکے۔

اس وقت انساب پر جامع کتابوں کے علاوہ خاص قریش کے نسب پر جو کتابیں ہمارے سامنے ہیں ان میں سب سے اہم کتاب مصعب الزبیری (۱۵۶-۲۳۶ھ) کی "نسب قریش" ہے۔

یہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی نسل سے تھے۔ ان کے دادا مصعب بن ثابت حضرت عبداللہ کے پوتے تھے۔ یہاں ہم آغاز انہی کی کتاب سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد بعض دوسرے قدیم مورخین اور سیرت نگاروں کے بیانات پیش کریں گے۔

(۱) مصعب اپنی کتاب میں "نضر بن کنانہ کی اولاد" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

فولد النضر بن كنانه: مالكا، ويخلد، والصلت۔ فأما الصلت بن النضر فإن من بني مليح بن خزاعة من يزعم أنه من ولده ..... فأما بنو يخلد فهم في بني عمرو بن الحارث بن مالك بن كنانة۔(۶)	نضر بن کنانہ کے بیٹے: مالک، یخلد، الصلت۔ الصلت بن النضر کے بارے میں بنی ملیح بن خزاعہ کے کچھ لوگ مدعی ہیں کہ وہ ان کی اولاد ہیں۔ بنو یخلد عمرو بن الحارث بن مالک بن کنانہ میں شامل ہوگئے۔

(۲) ابن حبیب (ف ۲۴۵ھ) کی کتاب المنمّق فی اخبار قریش حیدرآباد سے چھپی ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامے کی تفصیل میں لکھا ہے:

ثم افترق بنو النضر فرقتين: مالكا، ويخلد، ففضل الله مالكا على يخلد۔(۷)	پھر نضر کی اولاد دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی: مالک اور یخلد، اللہ تعالیٰ نے مالک کو یخلد پر فضیلت بخشی، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مالک کی نسل سے پیدا کیا۔

(۳) مشہور سیرت نگار ابن اسحاق (ف ۱۵۱ھ) کا بیان ہے:

"فولد النضر رجلين: مالک بن النضر، ويخلد بن النضر"۔

یعنی نضر کے دو بیٹے تھے: مالک اور یخلد۔ اس پر ابن ہشام (ف ۲۱۸ھ) نے یہ نوٹ لکھا:

والصلت بن النضر فيما قال أبو عمرو المدني، والذين يعزون إلى الصلت من خزاعة: بنو مليح بن عمرو۔(۸)	یعنی نضر کے ایک تیسرے بیٹے ابوعمرو مدنی کے بقول صلت تھے۔ خزاعۃ کی ایک شاخ بنی ملیح بن عمرو کو صلت کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔

(۴) مشہور مورخ بلاذری (ف ۲۷۹ھ) کی کتاب انساب الاشراف کی جلد اول سیرت نبویؐ پر ہے اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی تحقیق سے شائع ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

ولد النضر بن كنانة: مالك، ويخلد وهم في بني عمرو بن الحارث بن مالك بن كنانة۔ وقال هشام بن محمد: كان للنضر ابن يقال له الصلت، فدرج فيما يقول أكثر العلماء وقوم من خزاعة يذكرون أنهم من بني الصلت بن النضر .... ورأيت أبي والشرقي يثبتان أن الصلت بن النضر درج۔ (۹)

نضر بن کنانہ کی اولاد: مالک اور یخلد، یخلد بنو عمرو بن الحارث بن مالک بن کنانہ میں شامل ہیں۔ ہشام بن محمد کا کہنا ہے کہ نضر کا ایک اور بیٹا تھا جس کا نام صلت تھا، اکثر علمائے انساب کے نزدیک وہ لاولد تھا۔ خزاعۃ کے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ صلت کی اولاد ہیں، مگر میرے والد اور شرقی (بن قطامی) کی تحقیق یہی ہے کہ صلت بن النضر کے کوئی اولاد نہیں تھی۔

(۵) امام طبری (ف ۳۱۰ھ) کا ارشاد ہے:

كان لمالك أخوان يقال لأحدهما: يخلد، فدخلت يخلد في بني عمرو بن الحارث بن مالك بن كنانة، فخرجوا من جماع قريش، والآخر منهما يقال له الصلت لم يبق من ذريته أحد۔ (۱۰)

مالک بن نضر کے دو بھائی تھے، ایک کا نام یخلد تھا، اس کی اولاد بنوعمرو بن الحارث بن مالک بن کنانہ میں داخل ہوگئی اور قریش کی اصل جماعت سے نکل گئی، دوسرے بھائی کا نام صلت تھا، اس کی نسل میں کوئی باقی نہیں رہا۔

ان بیانات سے واضح ہے کہ نضر کے صرف تین بیٹے تھے: مالک، یخلد اور صلت۔ صلت کے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ وہ لاولد تھا۔ بلاذری نے ''درج'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس اصطلاح کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ شخص لاولد مرا۔ (۱۱) غالباً اسی وجہ سے بعض علما نے نضر کے بیٹوں میں صلت کا نام نہیں لیا۔ قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ نے یہ دعوی کیا کہ وہ صلت کی نسل سے ہیں مگر اس کی حیثیت ہمیشہ ایک دعوی ہی کی رہی۔

دوسرے بھائی یخلد کی اولاد اپنے چچازاد بھائیوں سے جا ملی اور ان کا شمار بنی کنانہ میں ہونے لگا۔

تیسرے بھائی مالک کے دو بیٹے تھے: فہر اور حارث، حارث کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس طرح قریش کی نسل فہر سے چلی اور اسی بنا پر علما کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ فہر سے اوپر کے لوگوں کی نسلیں قریش میں داخل نہیں ہیں۔

الغرض مالک، یخلد اور صلت کے سوا نضر بن کنانہ کا کوئی چوتھا بیٹا نہیں تھا۔ سیرت، انساب اور تاریخ وغیرہ کی دوسری کتابوں میں بھی صرف انہی تینوں کا ذکر ملتا ہے۔ مولانا باقر آگاہ کا یہ دعویٰ کہ نضر کا کوئی بیٹا نائطہ نام کا تھا قطعی بے بنیاد ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کتابوں میں قریش یا غیر قریش میں کسی شخص یا کسی قبیلے کا ذکر نائط یا نائطہ کے نام سے نہیں ملتا۔

مختلف سیاسی اور اجتماعی اسباب کی بنا پر بعد کی صدیوں میں اہل بیت سے خصوصاً اور خلفائے راشدین یا دوسرے صحابہ سے عموماً نسبی رشتہ قائم کرنے کے متنازعہ واقعات ملتے ہیں، جن میں مصر کے فاطمی حکمرانوں کا قصہ مشہور ہے لیکن راقم کی ناقص معلومات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اوپر کی پشتوں میں قریش کے نسب نامے سے چھیڑ چھاڑ کا کوئی واقعہ اسلامی تاریخ میں نہیں گزرا۔ حضور کی وجہ سے قریش کا سلسلہ نسب تدوین سے پہلے بھی اور تدوین کے بعد بھی ایسا مشہور و مسلم تھا کہ اس طرح کی کوئی حرکت قیامت تک کے لیے آدمی کی فضیحت کے لیے کافی تھی۔ سخت حیرت ہے کہ مولانا باقر آگاہ جیسے عالم نے اتنی بڑی جسارت کیوں کی!

(۲) عبداللہ الوائط کی شخصیت: اب ایک اور جد امجد کا قصہ جس کی اختراع کا سہرا کسی شخص نے اپنے سر لینے کی جرأت نہیں کی بلکہ اسے علامہ جلال الدین سیوطی کے سر منڈھ دیا کہ ان کے حوالے کے بعد مزید کسی سند کی ضرورت نہیں۔

تاریخ النوائط کے آخر میں مصنف نے ضمیمہ نمبر ۶ کے تحت علامہ سیوطی کے رسالہ کشف الانساب سے تقریباً پانچ صفحات کا طویل اقتباس نقل کیا ہے جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

اما بعد، فبنو الوائط قوم، وهم أولاد عبدالله الوائط بن محمد بن إسماعيل	اما بعد، بنوالوائط ایک قوم ہے اور یہ لوگ عبداللہ الوائط بن محمد بن اسماعیل کی اولاد ہیں۔

الذی مات فی المدینة المنورة، وھو ابن جعفر الصادق رضی اللہ عنہ ۔(۱۲) اسماعیل کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا۔ وہ جعفرالصادقؒ کے بیٹے تھے۔

ماخذ سے صرف نظر کرتے ہوئے اس بیان کی حقیقت جاننے کے لیے قریش کے ماہر انساب مصعب الزبیری (ف ۲۳۶ھ) کی کتاب ''نسب قریش'' کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ حضرت حسین بن علیؓ کی اولاد کے باب میں وہ رقم طراز ہیں:

''فولد محمد بن إسماعیل: جعفراً، وإسماعیل''۔(۱۳)

یعنی محمد بن اسماعیل (بن جعفر الصادق) کے بیٹے جعفر اور اسماعیل تھے۔یہی بات ابن حزم (ف ۴۵۶ھ) نے جمہرۃ انساب العرب میں لکھی ہے(۱۴)۔شیعہ علمائے انساب بھی یہی کہتے ہیں، عزیز الدین مروزی (ف بعد ۶۱۴ھ) الفخری فی انساب الطالبیین میں لکھتے ہیں:

''محمد بن اسماعیل بن جعفر الصادق کی نسل دو آدمیوں سے چلی: جعفر الاکبر السلامی اور اسماعیل الثانی، جعفر السلامی کے صرف ایک بیٹے محمد الحبیب تھے اور اسماعیل الثانی کے دو: احمد الاکبر اور محمد الثانی''۔(۱۵)

مشہور شیعہ ماہر انساب ابن عنبہ (ف ۸۲۸ھ) عمدۃ الطالب میں صراحت کرتے ہیں کہ محمد بن اسماعیل بن جعفر کی نسل دو آدمیوں سے چلی: اسماعیل الثانی اور جعفر الشاعر۔(۱۶)

''اتعاظ الحنفاء'' میں تقی الدین مقریزی (ف ۸۴۵ھ) کا بیان بھی ملاحظہ ہو:

''اسماعیل بن جعفر الصادق کی موت ان کے والد کی زندگی میں ۱۳۸ھ میں ہوئی۔ انہوں نے تین اولاد چھوڑی: محمد، علی اور فاطمہ۔ محمد بن اسماعیل کے صرف دو بیٹے تھے: جعفر اور اسماعیل، جعفر بن محمد بن اسماعیل کے دو بیٹے تھے: احمد جو لاولد تھے، دوسرے محمد جن کے چار بیٹے تھے: جعفر، اسماعیل، احمد، حسین''۔(۱۷)

یہ سارے بیانات اس پر متفق ہیں کہ محمد بن اسماعیل بن جعفر الصادق کے صرف دو بیٹے تھے: جعفر اور اسماعیل، عبداللہ نام کے کسی تیسرے بیٹے کا کوئی ذکر علمائے انساب اور مورخین نہیں کرتے۔ ہاں، فرقۂ اسماعیلیہ باطنیہ کی ایک جماعت محمد بن اسماعیل کا جانشین عبداللہ الرضی کو بتاتی ہے۔

یہ تو معلوم ہے کہ اسماعیلی جعفر الصادق کے بیٹے اسماعیل کو اپنا امام مانتے ہیں اور اثنا عشری

شیعہ کہتے ہیں کہ اسماعیل کا انتقال جعفر الصادق کی زندگی میں ہوگیا تو انہوں نے دوسرے بیٹے موسی کاظم کو جانشین بنادیا۔ اسماعیلی اسے تسلیم نہیں کرتے، ان کے نزدیک اسماعیل اور ان کے بعد ان کے بیٹے محمد بن اسماعیل امام تھے۔ انھی محمد بن اسماعیل کے بارے میں اسماعیلی کہتے ہیں کہ خلیفۂ عباسی کے خوف سے مدینے سے نکلے، پھر کوئی کہتا ہے کہ ہندوستان گئے، کوئی کہتا ہے عراق اور فارس گئے، مختلف شہروں میں چھپتے پھرے اور آخر میں تدمر میں انتقال کیا۔ اسماعیلیوں کے نزدیک انہی محمد بن اسماعیل کی زندگی سے ائمۂ مستورین کا عہد شروع ہوتا ہے۔ ان کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو سال یعنی تیسری صدی ہجری کے اواخر میں فاطمی حکومت کے بانی عبیداللہ المہدی کے ظہور تک کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ اس دوران محمد بن اسماعیل کے جانشینوں کے نام اور ان کی ترتیب سب مشکوک ہے۔ اس باب میں اسماعیلی فرقوں کے یہاں چار روایتیں عام ہیں:

۱۔ فاطمی روایت میں محمد بن اسماعیل کے بعد عبداللہ الرضی، پھر احمد الوفی، پھر حسین التقی۔

۲۔ فارسی نزاری روایت میں: احمد۔ محمد۔ احمد۔

۳۔ ہندوستانی نزاری روایت میں: احمد۔ محمد۔ عبداللہ۔

۴۔ دروزی روایت میں: احمد۔ عبداللہ۔ محمد۔ حسین۔ احمد۔ (۱۸)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ صرف فاطمی روایت میں محمد بن اسماعیل کے بیٹے کا نام عبداللہ بتایا گیا ہے اور اسی کو ان کا جانشین بھی قرار دیا گیا۔ دوسرے اسماعیلی فرقے اسے تسلیم نہیں کرتے۔ باقی مورخین اور علمائے انساب کے نزدیک محمد بن اسماعیل کا کوئی بیٹا اس نام کا تھا ہی نہیں جیسا کہ اوپر گذرا۔

ڈاکٹر محمد کامل حسین لکھتے ہیں کہ ہر اسماعیلی مورخ نے اس دور مستوری کی داستان اپنے ڈھنگ سے بیان کی ہے اور ان کے بیانات میں حد درجہ اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد مشہور اسماعیلی مورخ ادریس عمادالدین (ف ۸۷۲ھ) کی کتاب عیون الاخبار سے محمد بن اسماعیل کی مدینے سے ہجرت کے بارے میں ایک طویل اقتباس نقل کرکے اس کے تضادات اور تاریخی اغلاط پر روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں کہتے ہیں: ''اس طرح ۱۴۷ھ (جعفر الصادق کے انتقال کا سال) سے ۲۹۶ھ میں عبیداللہ المہدی کے ظہور تک کا جو زمانہ ہے اس کا صحیح حال خود اسماعیلی مورخین کو بھی پتہ نہیں''۔ (۱۹)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشف الانساب کے مصنف نے اسماعیلیوں کی کسی کتاب میں عباسی خلیفہ کے خوف سے محمد بن اسماعیل کی مدینے سے ہجرت کا واقعہ پڑھا اوران کے جانشین عبداللہ کا نام دیکھا، بس اسی شاخ نازک پر اس نے بھی اپنا آشیانہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔عبداللہ کو''الوائط'' کا لقب دیا اوراس عہد مستوری کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر ایک نئ کہانی گڑھ لی، جیسا کہ کشف الانساب کے اس اقتباس میں بعد میں آتا ہے کہ''مدینہ منورہ سے ان کے نکلنے کا سبب یہ ہوا کہ ایک روز خلیفہ سے ان کی لمبی بحث ہوگئی اور انہوں نے خلیفہ کو لاجواب کردیا۔خلیفہ نے طیش میں آکر عبداللہ الوائط کو مع ان کی اولاد وقبائل کے مدینے سے جلاوطن کردیا تو''سیدنا'' سب کو لے کر بغداد آئے اوروہاں سے تین روز کی مسافت پر واقع وائط نامی مقام پر سکونت پذیر ہوئے۔ یہ لوگ وہاں ایک عرصے تک رہے یہاں تک کہ جب بغداد کے آس پاس روافض کا غلبہ ہوا اور انہوں نے عبداللہ الوائط کو رفض قبول کرنے پر مجبور کیا...''۔اس کے بعد ایک ہیچ پوچ قصہ لکھا ہے۔حالانکہ مدینے سے محمد بن اسماعیل نکلے تھے۔اگر عبداللہ نام کا کوئی بیٹا ان کا تھا بھی جیسا کہ فاطمی دعویٰ کرتے ہیں تو کسی کو پتانہیں کہ وہ کہاں پیدا ہوا تھا۔

یہ لفظ''الوائط'' بھی دلچسپ ہے!اقتباس کے شروع میں عبداللہ الوائط کا نام جس طرح آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترکیب عبداللہ المعتز اور عبدالرحمٰن الداخل جیسی ہے، یعنی''الوائط'' عبداللہ کا لقب ہے، مگر بعد میں بتایا گیا کہ یہ بغداد کے قریب کسی مقام کا نام ہے۔سیاق سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جگہ کا یہ نام پہلے سے تھا۔اس صورت میں یہ ترکیب اضافی ہوگی، یعنی وائط والے عبداللہ، جیسے کہتے ہیں: فلاں بمبئی والا۔دوسری صورت یہ ہے کہ عبداللہ الوائط کے قیام کے بعد ان کی نسبت سے اس جگہ کا نام الوائط پڑا۔بہرحال دونوں صورتوں میں بلدانیات کی کتابوں میں اس کا ذکر آنا تھا، مگر اس موضوع پر سب سے مبسوط کتاب یاقوت کی معجم البلدان اور اس کا مستدرک مولفہ صفی الدین بغدادی دونوں اس مقام شریف کے ذکر سے خالی ہیں۔

جہاں تک لقب کا معاملہ ہے تو حیرت ہے کہ ہمارے سامنے القاب کے موضوع پر جو کتابیں ہیں مثلاً ابن مندہ (ف ۳۹۵ھ) کی فتح الباب فی الکنی والالقاب، ابن طاہر مقدسی (ف ۵۰۷ھ) کی معرفۃ الالقاب، ابن الجوزی (ف ۵۹۷ھ) کی کشف النقاب عن الاسماء والالقاب،

شمس الدین ذہبی (ف ۷۴۸ھ) کی ذات النقاب فی الالقاب اور ابن حجر (ف ۸۵۲ھ) کی نزہۃ الالباب فی الالقاب، ان میں سے کسی کتاب میں ''الوائط'' کا لقب مذکور نہیں۔ حالانکہ انھی کتابوں میں محمد الباقر، جعفر الصادق اور موسیٰ الکاظم کے القاب کا ذکر ہے۔ ''الوائط'' کے لقب میں جو ندرت ہے اس کی بنا پر اس کا ذکر خصوصیت سے ہونا چاہیے تھا۔ یہ کتابیں تو خیر عمومی انداز کی کتابیں ہیں، مگر ابوالحسن بیہقی (ف ۵۶۵ھ) کی لباب الانساب والالقاب والاعقاب تو خاص اہل بیت کی شخصیتوں پر ہے، آخر اس میں جعفر الصادق کے اس پڑپوتے کے لقب کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا؟

اب آیئے اصل ماخذ پر غور کریں یعنی کشف الانساب نامی کتاب پر جو سیوطی کی جانب منسوب کی گئی ہے۔ علامہ سیوطی اپنے عہد کے نامور عالم تھے۔ ان کا قیام ہندوستان کے کسی دور دراز گوشے میں نہیں تھا۔ وہ قاہرہ میں تھے، جہاں اس وقت علماے کبار کا مجمع تھا اور ان میں کئی ان کے حریف اور مخالف تھے۔ اہل بیت کے معروف نسب میں ایک نیا نام داخل کرنے یا فاطمیوں کے ایک امام کا رخ کسی اور طرف موڑنے کی بھیانک غلطی وہ کیسے کر سکتے تھے! اور اگر کرتے تو کیا ان کے حریف انہیں معاف کر دیتے اور اس غلطی کی صدائے بازگشت اس دور کے لٹریچر میں سنائی نہ دیتی۔ ایسی صورت میں نہ جانے کتنی کتابیں منظر عام پر آجاتیں جیسا کہ بعض دوسرے مسائل میں ان کے اور معاصرین کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی اور دونوں طرف سے ایک دوسرے کی کتابوں کے جواب لکھے گئے۔

اگر کچھ دیر کے لیے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ سیوطی نے اس نام کی کوئی کتاب لکھی تھی اور اس میں یہ ذکر تھا کہ محمد بن اسماعیل بن جعفر الصادق کے کوئی بیٹے عبداللہ الوائط نام کے تھے تو تنہا ان کا بیان اس نسب کی صحت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ سیوطی نویں دسویں صدی ہجری کے عالم ہیں اور نسب کا موضوع کوئی اجتہادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ سراسر نقل پر مبنی ہے۔ دوسری تیسری صدی ہجری کے ماہرین انساب جو کچھ لکھتے آئے ہیں اس سے نویں صدی ہجری کے سیوطی یا کسی اور مصنف کے لیے انحراف کرنا ممکن نہیں۔

''کشف الانساب'' نامی کتاب جس کا یہ اقتباس تاریخ النوائط کے مصنف نے شامل کتاب کیا ہے ہمارے نزدیک ایک جعلی کتاب ہے، یعنی کسی نے لکھ کر اسے علامہ سیوطی کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ سیوطی چونکہ کثیر التصانیف عالم تھے اور ان کی کتابوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے اس

لیے اس نے سوچا کہ یہ جعلی انتساب چھپ جائے گا۔ ان کی طرف اور بھی کئی جعلی کتابیں مختلف اسباب کی بنا پر منسوب ہوگئی ہیں۔

اس وقت علامہ سیوطی کی تصنیفات کی متعدد فہرستیں موجود ہیں۔ ان میں سے بعض خود انہوں نے مرتب کی تھیں اور ان کی کتابوں میں شامل ہیں۔ اور بعض ان کے تلامذہ یا دوسروں کے قلم سے ہیں لیکن اکثر سیوطی سے ہی منقول ہیں۔ تاہم ان کے درمیان کتابوں کی تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے، کیونکہ وہ مختلف اوقات میں مرتب ہوئیں اور ان میں مصنف کی جانب سے نئی کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا۔ ہمارے عہد کے محققین نے بھی کئی فہرستیں تیار کی ہیں۔ اس وقت میرے سامنے درج ذیل مطبوعہ اور قلمی فہرستیں ہیں:

۱۔ علامہ سیوطی نے ''التحدث بنعمۃ اللہ'' کے نام سے اپنے خودنوشت حالات لکھے تھے۔ ایک انگریز خاتون الزبتھ ماری سارٹن نے ۱۹۷۵ء میں کیمبرج سے اسے شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنی مکمل اور نامکمل ساری تصنیفات کی فہرست دی ہے اور انہیں سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔(۲۰)

۲۔ ''حسن المحاضرۃ فی تاریخ مصر والقاہرۃ'' تاریخ پر سیوطی کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے مختصراً اپنے حالات لکھے ہیں اور اپنی تصنیفات کی فہرست بھی دی ہے۔ یہ فہرست موضوعات پر مرتب ہے۔(۲۱)

۳۔ تصنیفات سیوطی کی ایک فہرست کا قلمی نسخہ چسٹر بٹی لائبریری ڈبلن میں نمبر ۳۴۲۰ کے تحت محفوظ ہے۔ یہ سیوطی کے ایک شاگرد احمد الحمصی الانصاری الشافعی کے قلم سے ہے اور آخر میں یہ صراحت ہے کہ ۹/ذوالحجہ ۹۰۳ھ کو یعنی علامہ سیوطی کی حیات میں انہوں نے یہ فہرست اپنے استاذ کے نسخے سے نقل کی ہے۔ گویا یہ تیسری فہرست بھی خود سیوطی کی مرتبہ ہے۔ اسے ڈاکٹر یحیی محمود ساعاتی نے مجلہ عالم الکتب ریاض جلد اول شمارہ ۲/مئی ۱۹۹۱ء میں شائع کیا۔ میرے پاس فہرست کے قلمی نسخے کا عکس بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر ساعاتی نے اپنے مضمون میں ایک اور قلمی فہرست سے فائدہ اٹھایا ہے جو ۱۱۲۱ھ کی مکتوبہ ہے۔ کاتب کا نام عثمان میری ہے اور کتب خانہ عارف حکمت مدینہ منورہ میں محفوظ ہے۔ یہ قلمی فہرست میرے سامنے نہیں ہے۔

۴۔علامہ سیوطی کی مرتبہ ایک اور فہرست کی نقل جامعہ ازہر قاہرہ کے کتب خانے میں نمبر ۳۱۰۱۸۶۱ کے تحت محفوظ ہے۔ یہ فہرست بھی فنون پر مرتب ہے۔کاتب نے اپنا نام اور کتابت کی تاریخ نہیں لکھی لیکن خط سے معلوم ہوتا ہے کہ گیارہویں صدی ہجری کا نسخہ ہے۔

۵۔احمد بن خلیل ابن اللبودی (۸۳۴-۸۹۶ھ) علامہ سیوطی کے معاصر علما میں سے تھے۔ان کے قلم سے لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ ''فہرست مصنفات السیوطی'' کے عنوان سے لائڈن یونیورسٹی ہالینڈ کے کتب خانے میں نمبر ۲۴ کے تحت محفوظ ہے۔لگ بھگ پچیس سال قبل ابن اللبودی کے بعض رسائل کے ساتھ اس فہرست کی میکروفلم بھی میں نے منگوائی تھی جو میرے پاس موجود ہے۔ابن اللبودی نے صراحت تو نہیں کی لیکن ان کا انتقال سیوطی سے پندرہ سال قبل ہوا تھا،اس لیے بظاہر یہ فہرست بھی سیوطی کی مرتبہ کسی فہرست سے منقول ہوگی۔

۶۔سیوطی کے ایک شاگرد عبدالقادر شاذلی (ف ۹۳۵ھ) تھے۔انہوں نے اپنے استاذ کے حالات پر ایک کتاب ''بہجۃ العابدین بترجمۃ حافظ العصر جلال الدین'' کے نام سے لکھی جو ڈاکٹر عبدالالہ نبہان کی تحقیق سے ۱۹۸۸ء میں مجمع اللغۃ العربیۃ بدمشق نے شائع کردی ہے۔اس کتاب کا تیسرا باب سیوطی کی تصنیفات پر ہے۔(۲۲)

۷۔ایک اور شاگرد طبقات المفسرین کے مصنف شمس الدین داودی (۹۴۵ھ) نے بھی اپنے استاذ کی سوانح لکھی تھی جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔تاہم تصنیفات سیوطی پر کتاب کا چوتھا باب ہمارے دوست ڈاکٹر محمد خیر بقاعی نے مجلۃ الدرعیہ کے شمارہ ۱۱-۱۲، ماہ رجب-شوال ۱۴۲۱ھ میں شائع کردیا ہے۔اس کتاب کی میکروفلم مرکز الملک فیصل للبحوث والدراسات الاسلامیہ کے کتب خانے میں نمبر ۲۰۶۶ف کے تحت محفوظ ہے۔(۲۳)

۸۔کشف الظنون کے یورپین ایڈیشن کے مرتب فلوغل نے چھٹی جلد کے آخر میں تصنیفات سیوطی کی ایک فہرست چھاپی ہے۔اس پر کاتب کا نام نہیں ہے لیکن تحریر کا سن ۱۱۶۹ھ لکھا ہے۔(۲۴)

۹۔مولانا عبدالاول جونپوری (ف ۱۳۳۹ھ) نے تصنیفات سیوطی کی ایک فہرست مرتب کی تھی جو ''شکد المعطی الحافل بمؤلفات السیوطی'' کے نام سے ۱۳۱۱ھ میں اعظم المطابع جونپور سے شائع ہوئی تھی۔(۲۵)

۱۰۔احمد الشرقاوی اقبال نے ۱۹۷۷ء میں رباط سے ایک کتاب ''مکتبۃ الجلال السیوطی'' کے نام سے شائع کی تھی۔اس میں انہوں نے سیوطی کی تصنیفات کا استقصا کرنے کی کوشش کی تھی۔

۱۱۔احمد الخزندار اور محمد بن ابراہیم شیبانی نے ۱۹۸۳ء میں تصنیفات سیوطی کے قلمی نسخوں پر ایک کتاب مرتب کی تھی۔اس کا نام ''دلیل مخطوطات السیوطی وأماکن وجودھا'' تھا۔اس فہرست میں مخطوطات کے ساتھ مطبوعہ اور مفقود کتابوں کا بھی تذکرہ تھا جو مکررات کے ساتھ ۹۸۱ عناوین پر مشتمل تھا۔

۱۲۔میرے بزرگ اور محترم دوست ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی (کراچی) نے اردو میں سیوطی کے احوال وتصنیفات پر ایک کتاب ''تذکرہ جلال الدین سیوطی'' کے نام سے کراچی سے ۱۴۲۱ھ میں شائع کی تھی۔انہوں نے لکھا ہے کہ تصنیفات سیوطی کی ایک فہرست ڈاکٹر تہامی کی زیر نگرانی استاذ عزالدین نے تیار کی تھی جو متحدہ عرب امارات سے نہایت آب وتاب سے شائع ہوئی۔اس سے قبل چشتی صاحب نے بھی ایک فہرست مرتب کی تھی۔اس کتاب میں انہوں نے پہلے استاذ عزالدین کی فہرست درج کی ہے جو ۳۸۰ کتابوں پر مشتمل ہے، پھر اس پر ۴۸۸ کتابوں کا اضافہ کیا۔اس طرح دونوں فہرستوں کی مجموعی تعداد ۷۸۶ ہوتی ہے۔(۲۶)

۱۳۔سب سے طویل فہرست استاذ ایاد خالد الطباع نے مرتب کی جوان کی کتاب ''الامام الحافظ جلال الدین السیوطی معلمۃ العلوم الاسلامیۃ'' میں شامل ہے۔یہ فہرست ۱۱۹۴ عناوین پر مشتمل ہے۔ان کے علاوہ مصنف نے دس ایسی کتابوں کا ذکر کیا ہے جو منحول ہیں یعنی سیوطی کی جانب ان کی نسبت غلط یا مشکوک ہے۔

افسوس کہ مندرجہ بالا فہرستوں میں سے کسی فہرست میں ''کشف الانساب'' نامی کسی کتاب کا ذکر نہیں، یہاں تک کہ تقریباً ۱۲۰۰ ناموں پر مشتمل استاذ ایاد خالد الطباع کی اس آخری فہرست میں بلکہ ان دس منحول کتابوں میں بھی یہ شامل نہیں ہے جن کی جانب استاذ طباع نے اشارہ کیا ہے۔

اب ذرا اس کتاب کی زبان ملاحظہ ہو۔مصنف تاریخ النوائط نے اس کا جو اقتباس نقل کیا ہے وہی ہمارے پیش نظر ہے۔کتاب کے قلمی نسخے کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ذیل میں عربی زبان کی چند اغلاط کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا ہندوستانی ہے۔

۱۔ص ۵۵۶: ''فأبی بنو الوائط من الإطاعة''۔

یعنی بنوالوائط نے اطاعت سے انکار کر دیا، عربی زبان میں فعل اَبٰی یَاْبٰی کا صلہ ''من'' نہیں آتا بلکہ اس کا مفعول آتا ہے۔ صحیح عبارت: ''فأبی بنو الوائط الإطاعة'' ہے۔ نحو وصرف ان علوم میں شامل ہے جن میں علامہ سیوطی نے خود ''تبحر'' کا دعویٰ کیا ہے (۲۷)۔ یہ دعویٰ نہ بھی کرتے جب بھی وہ ایسی فاش غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ اردو میں ''اطاعت سے انکار کرنا'' بولتے ہیں، چنانچہ لکھنے والے نے اردو میں یہ عربی لکھی اور ''سے'' کے لیے حرف جر ''من'' کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ ایسا ہی جیسے عربی میں ''حرص'' کا صلہ ''علیٰ'' آتا ہے، عربی میں کہیں گے: ''فلان حریص علی العلم'' اب کوئی شخص اس کا ترجمہ ''فلاں علم پر حریص ہے'' کرے تو یہ اردو تو نہ ہوئی۔

۲۔ ص ۵۵۶: ''فإذا جمعوا فقال لهم''۔

یعنی جب وہ جمع ہو گئے تو امیر نے ان سے کہا۔ ''اذا'' اور ''لما'' دونوں کے جواب پر حرف فاء نہیں آتا۔ لکھنے والے نے اردو میں جواب پر جو ''تو'' آتا ہے اس کی جگہ پر عربی میں حرف فاء داخل کر دیا جس کا یہاں موقع نہیں۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ اس نے ''لما'' کی جگہ پر ''اذا'' کا استعمال کیا ہے۔ اردو میں چونکہ دونوں کے معنیٰ ''جب'' کے ہوتے ہیں اس لیے بے خیالی میں اس نے دونوں کے معنوی فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔

۳۔ ص ۵۵۶: ''وأیضاً ملتمس فی خدمتکم أن بعض الناس لا یقبلون إطاعتنا''۔ ''ملتمس فی خدمتکم'' یعنی آپ کی خدمت میں یہ التماس ہے، ہرگز عربی تعبیر نہیں ہے۔ اس پر فارسی اور اردو کا اثر واضح ہے۔

۴۔ ص ۵۵۴: ''وقع بینه وبین الخلیفة بحث کثیر''۔

یعنی عبداللہ الوائط اور خلیفہ کے درمیان بہت بحث ہوئی۔ لفظ ''بحث'' کا اس سیاق میں استعمال اردو کی چغلی کھا رہا ہے۔

۵۔ ص ۵۵۵ پر بغداد کو دو جگہ لام تعریف کے ساتھ ''البغداد'' لکھا ہے۔ کوئی عرب عامی بھی یہ غلطی نہیں کر سکتا کجا کہ وہ عالم ہو یا سیوطی جیسا علامہ۔

یہ غلطی عام طور پر عجمی مصنفین کرتے ہیں، جن شہروں کے ناموں پر لام تعریف آتا ہے ان کو فارسی اور اردو کے طریقے پر لام تعریف کے بغیر لکھیں گے، جیسے القاہرہ کو قاہرہ (۲۸)، البصرہ کو

بصرہ، المدینۃ المنورۃ کو مدینۃ المنورہ۔اس کے برخلاف جن پر لام تعریف نہیں آتا ان پر عربیت کے جوش اور فصاحت کے شوق میں لام تعریف داخل کر دیں گے مثلاً مکۃ المکرمۃ کو المکۃ المکرمۃ، دمشق کو الدمشق اور بغداد کو البغداد۔

۶۔ص ۵۵۵: ''لم لا تعترفوا الخلافۃ لجدکم علی رضی اللہ عنہ''۔

اس جملے میں زبان کی دو غلطیاں ہیں۔ایک تو لا نافیہ کے بعد فعل مضارع ''تعترفون'' کی نون حذف کر دی، حالانکہ نون کا حذف لا ناہیہ کے بعد ہوتا ہے۔دوسرے ''اعتراف'' کا صلہ کہاں ہے؟ عربی میں ''اعترف بالأمر'' کہتے ہیں۔''اعترف الأمر'' درست نہیں۔ یہ بھی اردو کا اثر ہے۔چونکہ اردو میں کسی چیز کا اعتراف بولتے ہیں، کسی چیز سے اعتراف نہیں کہتے۔اس لیے لکھنے والے نے یہ عربی اپنی زبان میں لکھ دی۔ چند سطروں بعد ''أن تعترفوا بطریقتنا'' صحیح لکھا ہے لیکن یہاں اسے دھیان نہیں رہا۔

یہ چند نمایاں غلطیاں ہیں جن کی جانب اشارہ کیا گیا۔اس اقتباس میں اور بھی قرائن ہیں جنہیں طوالت کے خوف سے نظر انداز کر دیا ہے۔بہر حال اس تفصیل سے واضح ہے کہ عبداللہ الوائط کی شخصیت سراسر جعلی ہے۔محققین علماے انساب کے نزدیک محمد بن اسماعیل بن جعفر الصادق کے صرف دو بیٹے تھے، جعفر اور اسماعیل۔ نیز کشف الانساب نامی کتاب ایک جعلی کتاب ہے جسے کسی ہندوستانی نائطی نے لکھ کر علامہ سیوطی کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ (باقی)

حواشی

(۱) میزان الاعتدال، شمس الدین ذہبی، تحقیق علی محمد البجاوی، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۹۶۳ء، لسان المیزان، ابن حجر، تحقیق عبدالفتاح ابوغدہ، دار البشائر الاسلامیہ، بیروت، ۲۰۰۲ء۔ (۲) ثقافۃ الہند، آزاد بھون، دہلی، ۳۳: ۲ سنہ ۱۹۸۲ء، ہندوستانی زبان، بمبئی، جلد ۹ شمارہ ۱-۲۔ (۳) ملاحظہ ہو اس کتاب کا قلمی نسخہ، فرنگی محل کلکشن: عربیہ ۱۰۲۰/۵، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ یہ شعر ق ۱/۷۱ اور شرح ق ۲/۷۱ پر ہے۔ یہ شعر اور اس کی شرح جیسا کہ گذرا مولانا فیصل احمد ندوی بھٹکلی نے مجھے بھجوائی تھی۔ ۲۳/ جولائی ۲۰۱۶ء کو علی گڑھ جانا ہوا تو ڈاکٹر عطا خورشید صاحب کی عنایت سے آزاد لائبریری میں یہ نسخہ خود دیکھا اور از سر نو یہ اقتباسات نقل کیے۔ (۴) النفحۃ العنبریۃ، ق ۱/۷۲۔ (۵) ملاحظہ ہو طبقات النسابین، بکر ابوزید، مکتبۃ دار الرشد، ریاض، ۱۴۰۷ھ، ص ۱۳۱ شمارہ ۱۷۔ (۶) نسب قریش، مصعب الزبیری،

تحقیق لیفی بروفنسال، دارالمعارف، قاہرہ ۱۹۲۰ء، ص ۱۱-۱۲۔ (۷) المنمق فی اخبار قریش، ابن حبیب، تحقیق خورشید احمد فارق، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، تصویر عالم الکتب، بیروت ۱۴۰۵ھ، ص ۲۰۔ (۸) السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام، تحقیق مصطفی السقا وغیرہ، مصطفی البابی الحلبی، قاہرہ، ۱۹۵۵ء، ۱: ۹۴-۹۵۔ (۹) انساب الاشراف، بلاذری، جلد اول، تحقیق محمد حمید اللہ، دارالمعارف، قاہرہ، ۱۹۵۹ء، ۱: ۳۸۔ (۱۰) تاریخ الطبری، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، دارالمعارف، قاہرہ، ۱۹۷۹ء، ۲: ۲۶۳۔ (۱۱) دیکھیے اصمعی کا قول جوہری کی صحاح میں، تحقیق احمد عبدالغفور عطار، دارالعلم للملایین، بیروت، ۱۹۸۷ء، ۱: ۳۱۳، اصطلاح کے لیے ملاحظہ ہو: لباب الانساب والالقاب والاعقاب، ابوالحسن علی بن ابی القاسم بن زید البیہقی، تحقیق سید مہدی رجائی، طبع دوم، قم، ایران، ۲۰۰۷ء، ص ۳۲۶۔ (۱۲) تاریخ النوائط، نواب عزیز جنگ بہادر، عزیز المطابع، حیدرآباد، ۱۳۲۲ھ، ص ۵۵۴۔ (۱۳) نسب قریش: ۶۴۔ (۱۴) جمہرۃ انساب العرب، ابن حزم، تحقیق عبدالسلام ہارون، دارالمعارف، قاہرہ، ۱۹۸۳ء، ص ۲۰۔ (۱۵) الفخری فی انساب الطالبیین، عزیز الدین مروزی، تحقیق سید مہدی رجائی، قم، ۱۴۰۹ھ، ص ۲۳۔ (۱۶) عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب، ابن عنبہ، مطبعہ حیدریہ، نجف، ۱۳۸۵ھ، ص ۲۱۶۔ (۱۷) اتعاظ الحنفاء باخبار الفاطمیین الخلفاء، مقریزی، جلد اول، تحقیق جمال الدین الشیال، المجلس الاعلیٰ للشؤون الاسلامیہ، قاہرہ، ص ۱۵۔ (۱۸) اس تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: موجز دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مرکز الشارقہ للابداع الفکری، ۱۹۹۸ء، ۳: ۷۶۸-۷۶۹۔ (۱۹) طائفۃ الاسماعیلیۃ: تاریخہا، نظمہا، عقائدھا: محمد کامل حسین، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ، قاہرہ ۱۹۵۹ء، ص ۱۵، ۱۸-۱۹۔ (۲۰) ملاحظہ ہو: ص ۱۰۵-۱۳۶۔ (۲۱) حسن المحاضرۃ فی تاریخ مصر والقاہرہ، سیوطی، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، داراحیاء الکتب العربیہ، قاہرہ، ۱۹۶۷ء، ۱: ۳۳۹-۳۴۴۔ (۲۲) ملاحظہ ہو، ص ۱۷۵-۲۵۵۔ (۲۳) اصل نسخہ برلن کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ۱۰۵۰ھ کا لکھا ہوا ہے۔ کاتب کا نام رمضان بن موسیٰ العطیفی الحنفی ہے۔ (۲۴) کشف الظنون، حاجی خلیفہ، مرتبہ فلوغل، جلد ۶، لندن، ۱۸۵۲ء، ص ۶۶۵-۶۷۹۔ (۲۵) لفظ "شکلہ" کے آخر میں دال ہے، فتح اول کے ساتھ مصدر ہے اور ضم کے ساتھ اسم بمعنی عطیہ، ڈاکٹر احمد خاں کی کتاب معجم المطبوعات العربیۃ فی شبہ القارۃ الہندیہ، مطبوعہ مکتبۃ الملک فہد الوطنیۃ، ریاض ۱۴۲۱ھ، ص ۲۷۴ پر "شکر" مصحح کی غلطی ہے۔ دور حاضر کی مرتبہ فہرستوں میں یہ سب سے قدیم فہرست ہے۔ کتابوں پر نمبر پڑے ہوئے ہیں، ان کے مطابق ۵۰۲ کتابوں کے نام اس میں درج ہیں۔ اس کا عکس عزیزی ڈاکٹر محمد ثاقب ندوی نے علی گڑھ سے فراہم کیا ہے۔ (۲۶) ملاحظہ ہو تذکرہ علامہ جلال الدین سیوطی، ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی، الرحیم اکیڈمی، کراچی، ۱۴۳۱ھ، ص ۱۷۱۔ (۲۷) حسن المحاضرۃ ۱: ۳۳۸۔ (۲۸) دیکھیے سید رشید رضا کا نوٹ علامہ شبلی کے ایک خط پر، الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی، علامہ شبلی نعمانی، مرتبہ محمد اجمل اصلاحی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء، ص ۲۲۵۔

براؤن اور شبلی

جناب آصف نعیم

شبلی (۱۹۱۴ـ۱۸۵۷ء) نے شعرالعجم کا آغاز ۶/مارچ ۱۹۰۶ء میں کیا اور ۶/ستمبر ۱۹۰۷ء میں حادثۂ پا کی تکلیف کے باوجود پہلی جلد مکمل کر لی۔ تصنیف کے اسباب کی طرف وہ ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں ''لیکن افسوس یہ ہے کہ آج تک کسی اسلامی زبان میں ایران کی شاعری کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعری کب شروع ہوئی اور کن اسباب سے شروع ہوئی؟ کس طرح عہد بہ عہد بڑھی؟ کیا کیا انداز قائم ہوئے؟ کیا کیا صورتیں بدلیں؟ ملکی اور قومی حالتوں نے اس پر کیا کیا اثر کیے؟ خود اس نے ملک اور قوم پر کیا اثر ڈالا؟

شعرا کے تذکرے بہت ہیں لیکن وہ درحقیقت بیاض اشعار ہیں، جن میں شعرا کے عمدہ اشعار انتخاب کر کے لکھ دیے ہیں، شعرا کے حالات اور واقعات کم اور نہایت کم ہیں اور شاعری کے عہد بہ عہد انقلابات اور ان کے اسباب کا تو مطلق ذکر نہیں، میں اس کمی کو مدت سے محسوس کر رہا تھا اور اکثر اس ادھیڑ بن میں رہتا تھا۔ مئی ۱۸۹۴ء میں میرے معزز دوست اور استاد مسٹر آرنلڈ نے مجھ کو اطلاع دی کہ جرمن کے پروفیسر جیمس ڈارمسٹیٹر نے اس موضوع پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے، میں اس زمانہ میں فرنچ زبان سیکھ رہا تھا(۱) بڑے شوق سے کتاب منگوائی، لیکن وہ ۸۸ صفحوں کا ایک رسالہ تھا جس میں شعرا کے نہایت معمولی حالات تھے، ایک مدت کے بعد اس مصنف کی ایک اور ضخیم کتاب شائع ہوئی جو تحقیق اور تدقیق کے لحاظ سے نہایت حیرت انگیز تھی (۲)، لیکن وہ زبان کی تاریخ ہے، جس میں ژند (۳) پہلوی وغیرہ زبانوں پر نہایت محققانہ بحث کی ہے، اور اسلام کے قبل کی تصنیفات کا سراغ لگایا ہے، شاعری کی تاریخ سے اس کو لگاؤ نہیں۔ (۴)

شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ۔

سید سلیمان ندوی نے شعرالعجم جلد پنجم کے دیباچہ میں شبلی کے ایک خط مورخہ ۱۸۹۹ء(۵) کے حوالے سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ شبلی کو اس موضوع کا خیال ۱۸۹۹ء میں آیا تھا پھر آگے لکھتے ہیں ''عجیب اتفاق کہ اسی وقت اس عنوان پر ہندوستان اور یوروپ کے دو اوراکابر مصنّفین بھی قلم اٹھا چکے تھے، شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد لاہور میں اور پروفیسر براؤن انگلینڈ میں، ۱۹۰۷ء(۶) میں ادھر لاہور سے سخندان پارس نکلی اور اُدھر انگلینڈ سے A Literary History of Persia شائع ہوئی لیکن شعرالعجم کے مصنف کا معیار تخیل ان دونوں سے الگ رہا''۔(۷)

سخندان فارس اور شعرالعجم دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔سخندان فارس (۸) کا موضوع Philology اور تہذیبی پس منظر مین زبان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا مطالعہ ہے۔ سخندانِ فارس کے گیارہویں لکچر میں نظم فارسی کی تاریخ کو موضوع بنایا گیا ہے۔آزاد نے شعرائے فارسی کے چار طبقے قائم کیے ہیں۔

طبقات شعرائے فارسی: (۱) رودکی، اسدی، فردوسی وغیرہ۔(۲) خاقانی، انوری، نظامی۔ (۳) سعدی، حافظ۔(۴) جلال اسیر، قاسم مشہدی، قاسم دیوانہ وغیرہ۔

ممکن ہے آزاد کے ذہن میں غالب کا یہ نقطہ نظر رہا ہو''رودکی اور فردوسی سے لے کر خاقانی و ثنائی وانوری وغیرہم تک ایک گروہ، ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے، سعدی و جامی و ہلالی۔یہ اشخاص متعدد نہیں۔فغانی اور ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔خیال ہائے نازک ومعانی بلند لایا''۔(۹)

آزاد نے سخندان فارس میں ایسے نکات انگیز مسائل اٹھا دیے ہیں کہ انہیں پھیلا کر نظریہ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔شعرالعجم کا بنیادی موضوع اہم شعرا کے کلام پر ریویو اور اصناف کا مطالعہ ہے اور اس لحاظ سے آج بھی یہ کتاب اپنی امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔انتخاب اشعار اور اشعار کو الفاظ کی قدر و قیمت کی روشنی میں بیان کرنے کے اعتبار سے ہندوستان اور ایران میں یہ پہلا کارنامہ ہے۔

شبلی کی اس استعداد اور اس بصیرت کا ان کے معاصر ای۔جی براؤن (۱۸۶۲۔۱۹۲۶ء) نے "A Literary History of Persia" جلد سوم (۱۹۲۰) میں دل کھول کر اعتراف کیا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب یہ جلد شائع ہوئی تو مغرب میں بھی اپنے کارنامے کی پذیرائی کو دیکھنے کے لیے شبلی

اس دنیا میں نہ تھے۔ ان الفاظ سے بہتر گلہائے عقیدت اور کیا ہوں گے۔

"On the whole, however the best and most complete critical study of Hafiz with which I am acquainted is contained in Shibli Numani's work on Persian Poetry entitled Sherul Ajam..........I feel that I can not do better than summarize at any rate that portion of this notice which deals with the poet's life and the few facts concerning his personal circumstances and relations with his contemporaries (۱۰)

براؤن نے ہند ایرانی شعرا پر بھی اپنے محاکمے میں شبلی کے اقداری فیصلوں سے نہ صرف بھرپور استفادہ کیا ہے بلکہ شبلی کے انتخاب کردہ اشعار بھی شامل کر لیے ہیں۔

شبلی نے شعرالعجم کی جلد اول میں براؤن کی "A Literary History of Persian" کو سب سے زیادہ مکمل اور جامع کتاب قرار دیا ہے ۔شبلی کی زندگی میں اس کی دو جلدیں پہلی ۱۹۰۲ء اور دوسری ۱۹۰۶ء میں شائع ہو چکی تھیں۔شبلی کی یہ تحریر ۶/ستمبر ۱۹۰۷ء کی ہے اپریل ۱۹۰۷ء میں شبلی کو جب براؤن کی کتاب کا علم ہوا اور منگوا کر انہوں نے جب دیکھا تو پہلا تاثر کچھ منفی تھا۔

''بلا مبالغہ اور بلا تصنع کہتا ہوں کہ براؤن کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہوا' نہایت عامیانہ اور سوقیانہ ہے، برادر اسحاق سے پڑھوا کر سنی' خود بھی الٹ پلٹ کر دیکھا' فردوسی کی نسبت صرف دو تین صفحے لکھے ہیں جس میں اس کے اقتباسات بھی شامل ہیں، مذاق اتنا صحیح ہے کہ آپ فردوسی کا درجہ سبعۂ معلقہ کے برابر بھی نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کسی حیثیت سے یہ کتاب اور شعرائے فارسی کے کلام کے برابر نہیں ہے مع سود و ہرجہ کے آپ سے اس کے دام واپس لوں گا''۔(۱۲)

ذیل میں براؤن نے مذکورہ تصنیف میں جہاں شبلی کا ذکر کیا ہے یا ان سے استفادہ کیا ہے ان کا ایک عمومی ترجمہ ملاحظہ ہو۔ یہ ترجمہ A Literary History of Persia جلد سوم اور جلد چہارم (Goodword Books, New Delhi, Reprinted 2011) سے کیا گیا ہے۔

امیر خسرو: قارئین اردو کو بہت ہی اعلیٰ جدید تصنیف شبلی کی شعرالعجم کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ یہ کتاب علی گڑھ سے دو جلدوں میں ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء میں لیتھو پر شائع ہوئی ہے(۱۳)۔

اس تصنیف میں فردوسی اور ان کے پیش رووں سے حافظ تک تقریباً بیس کلاسکی شعرا کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ان شعرا میں امیر خسرو دہلوی کا ایک مفصّل جائزہ شامل ہے۔اس جائزے میں ان کے دوست اور معاصر شاعر حسن دہلوی کے بارے میں بھی وافر اطلاعات ہیں۔(جلد سوم،ص ۱۰۸)

سلمان ساؤجی: دو ہندوستانی مصنفوں کی نگارشات کی طرف آپ کی توجہ چاہوں گا۔ایک انگریزی میں ہے اور دوسری اردو میں۔دوسری نگارش ایک قابل توصیف تصنیف شبلی کی شعرالعجم ہے۔ اس میں کوئی بیس اہم شعرائے فارسی کا مطالعہ شامل ہے۔یہ کتاب ۲۵-۱۳۲۴/۷-۱۹۰۶ء میں علی گڑھ سے لیتھو پر شائع ہوئی ہے۔(جلد سوم،ص ۶۱-۲۶۰)

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا سلمان نے غالباً ۱۳۷۸/۷۷-۸ مین ان دو قصاید کے ایک سال بعد وفات پائی ہے جن کا حوالہ اوپر آیا ہے۔اس سے واضح ہے کہ وہ اپنی طویل زندگی کے آخر تک شعر کہتے رہے اور دولت شاہ کے بیان کے برخلاف گوشہ نشین نہیں ہوے۔یہ الگ بات ہے کہ ان کے دل مین اس کا ارادہ اور اس کی خواہش ضرور تھی جیسا کہ ان دلچسپ اشعار سے عیاں ہے جنہیں شبلی نعمانی نے شعرالعجم جلد دوم میں نقل کیا ہے۔(جلد سوم،ص ۲۶۵)

شبلی نعمانی،سلمان پر اپنے جائزے کو مختلف اصناف سخن میں ان کی مہارت کے اعتراف کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔براؤن نے شبلی کی اس رائے کو کہ سلمان قدما و متوسطین مین برزخ ہین اور اس رائے کو بھی کہ ان کی شاعری کا اصل میدان قصیدہ گوئی ہے۔زبان کی صفائی اور روانی کے ساتھ ترکیبوں میں وہ چستی جو ان سے پہلے نہ تھی اور جو خاص متوسطین شعراء کا انداز ہے' اپنی آرا میں شامل کرتے ہوئے وہی اشعار بھی نقل کیے ہیں جو شعرالعجم میں ہیں۔(جلد سوم،۶۶-۲۶۵)

اس کے بعد شبلی،سلمان کی دقیق اور نازک مضمون آفرینی جو متوسطین اور متاخرین کا کارنامہ فخر ہے کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔(جلد سوم،ص ۲۶۷)

پھر شبلی نعمانی نے مقطعات پر قلم اٹھایا ہے۔بمبئی سے لیتھو پر شائع ہونے والے دیوان میں قطعات کے شامل نہ ہونے کی اطلاع براؤن نے شبلی ہی سے حاصل کی ہے اور وہی قطعات نقل کیے ہیں جن میں سیاہ رنگ کے گھوڑے کو واپس کرنے،آشوب چشم اور درد پا کی وجہ سے دربار نہ جاسکنے کا ذکر ہے۔(جلد سوم،ص ۷۱-۲۶۹)

آخر میں شبلی نعمانی نے سلمان کی بدعات علی الخصوص ایہام کا ذکر کیا ہے۔(جلد سوم،ص ۲۷۱)

خواجہ حافظ: بطور کلی حافظ کا بہترین اور مکمل ترین تنقیدی مطالعہ جس سے میں واقف ہوں شبلی نعمانی کی اردو تصنیف شعر العجم میں شامل ہے۔(جلد دوم،ص ۲۹۲۔۲۹۷)

میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میں سوانح حافظ سے متعلق ان کے شخصی حالات کے کچھ حقائق اور معاصرین سے ان کے تعلقات پر شبلی کی پیش کردہ تفصیلات کی تلخیص پیش کردوں۔اس سے بہتر میں کچھ نہ کرسکوں گا۔خواندمیر کی حبیب السیر اور عبدالنبی فخر الزمانی کا سوانحی ماخذ کے طور پر مصنف نے خصوصی ذکر کیا ہے۔

شبلی اپنے واقعات کو منظم طور پر ترتیب دیتے ہیں اور نام ونسب،تعلیم کے ذکر سے آغاز کرتے ہیں۔ان کا ماخذ میخانہ ہے لیکن بظاہر وہ اسے پوری طرح قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔(۱۴)

اس کے بعد شبلی نعمانی نے ان بادشاہوں اور شاہزادوں کا ذکر کیا ہے جن کی حافظ کو حمایت اور سرپرستی حاصل تھی(۱۵)۔مولانا شبلی نعمانی اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ عام خیال کہ حافظ بادشاہوں یا شہزادوں کی طرف سے بے نیاز تھے خلاف حقیقت ہے اور ان کے اشعار سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ان کے اشعار میں کئی معاصر حکمرانوں جن میں شاہ شجاع،شیخ ابواسحاق،سلطان محمود،شاہ منصور اور ہرمز اور یزد کے حکمران شامل ہیں کی مدح ملتی ہے۔

شبلی نعمانی نے غزل کو درجہ کمال تک پہنچانے اور اس کے امکان کو وسیع تر کرنے کا سہرا حافظ کے سر باندھا ہے اور اس سے کچھ کم ان کے معاصرین سلمان اور خواجو کے سر باندھا ہے۔

براؤن نے شبلی کے اس نظریے کی کہ سعدی،خسرو اور حسن غزل میں زیادہ تر عشق و عاشقی کے جذبات اور معاملات بیان کرتے تھے۔خواجو نے دنیا کی بے ثباتی،سلمان کا خاص مذاق مضمون آفرینی،جدت تشبیہ اور صنائع لفظی ہے کی تلخیص پیش کرتے ہوئے حافظ کی خواجو اور سلمان کے جواب میں شبلی نے (فرق مراتب کا اندازہ لگانے کے لیے) جو غزلیں مثال کے طور پر دی ہیں براؤن نے انہیں کو اپنی کتاب میں شامل کرلیا ہے۔(جلد سوم،ص ۲۷۱۔۲۹۸)

ابتدائی دور سے سترھویں صدی کے اواخر تک کے سر برآوردہ شعرائے فارسی کا مکمل ترین اور بہترین جائزہ جیسا کہ میں نتیجہ برآمد کرسکا ہوں ممتاز اسکالر شبلی نعمانی کی اردو یا ہندوستانی (بدنصیبی

کی بات ہے) میں تصنیف شعرالعجم ہے۔

اس تصنیف کی تیسری جلد (۷-۱۹۰۶/ ۲۵-۱۳۲۴) میں سولھویں اور سترہویں صدی کے سات شعرا فغانی (ف ۱۵۱۹/ ۹۲۵)،فیضی (ف ۹۶-۱۵۹۵/ ۱۰۰۴)،عرفی (ف ۹۱-۱۵۹۰/ ۹۹۹)،نظیری (ف ۱۳-۱۶۱۲/ ۱۰۲۱)، طالب آملی (ف ۲۷-۱۶۲۶/ ۱۳۳۶)، صائب (ف ۷۰-۱۶۶۹/ ۱۰۸۰) اور ابوطالب کلیم (ف ۱۶۵۱/ ۱۰۶۱) کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ سب فیضی کو چھوڑ کر ایرانی تھے جنھیں مغل دربار کی فیاضی ہندوستان کھینچ لائی تھی۔فیضی کو شبلی امیر خسرو کے بعد ایسا واحد ہندوستانی نژاد شاعر قرار دیتے ہیں جسے اہل زبان کو بھی چاروناچار ماننا پڑا۔(۱۶)(جلد چہارم،ص ۱۶۴)

شبلی نے اکیاون ایسے شعرا کا نام بتایا ہے جو اکبر کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔شبلی نے کئی ایسے اشعار نقل کیے ہیں جن میں شعراے ایران کے دل میں ہندوستان کی تمنا کا ذکر ہے۔اس ضمن میں صائب،ابوطالب کلیم،علی قلی سلیم،رسمی کے وہ شعر بھی براؤن نے نقل کر دیے ہیں جو شعرالعجم میں ہیں۔(جلد چہارم،ص ۶۷-۱۶۵)

بابا فغانی: شبلی نے شعرالعجم میں والہ داغستانی کی ریاض الشعرا کی طرح انہیں شعر میں نئے طرز کا موجد قرار دیا ہے۔(جلد چہارم،ص ۲۲۹)

عرفی: یہ اس صدی (۱۶۰۰-۱۵۰۰) کے ان تین شعرا،ایک ان کے ہم وطن بابا فغانی اور دوسرے فیضی، میں سے ہیں جن کو شبلی نے اپنی شعرالعجم میں موضوع مطالعہ قرار دیا ہے۔فیضی کے بارے میں شبلی کی رائے یہ ہے کہ وہ ان دو ہندوستانیوں میں سے ایک ہیں جن کو اہل زبان نے بھی مانا ہے (ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۱۶)۔شبلی نے شعرالعجم میں عرفی پر کوئی ۵۳ صفحات لکھے ہیں جو فیضی پر لکھے گئے صفحات سے زیادہ ہیں اور بقیہ اور ساتوں کے مقابلے جن کا ذکر تیسری جلد میں ہوا ہے اور زیادہ ہیں۔شبلی اس کا بھی ساتھ ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی (عرفی کی) عدم مقبولیت کا سبب ان کی رعونت ہے۔گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس شاعر کے بارے میں شبلی کے دلچسپ اور مفصل مطالعہ اور چھ نمایاں شعری خوبیوں، زور کلام ، الفاظ کی نئی نئی ترکیبیں، جدت استعارات وتشبیہ اور مسلسل مضامین،جن کا انہوں نے ذکر کیا ہے کو تفصیل کے ساتھ دہرا نہیں سکتے۔(جلد چہارم،ص ۴۸-۲۴۱)

فیضی: مکمل ترین اور تحسین آمیز ترین جائزہ جو میری نگاہ میں ہے وہ شعر العجم میں شبلی نعمانی کا ہے۔ شبلی نے جو اشعار نقل کئے ہیں ان میں اثر آفریں ترین وہ ہے جو اولاد کی وفات سے متعلق ہے۔ (جلد چہارم، ص ۲۴۴)

سات شعرا میں سے چار وہ جن کو شبلی نے شعر العجم میں مورد مطالعہ قرار دیا ہے کا تعلق (۱۷۰۰-۱۶۰۰)/(۱۱۱۱-۱۰۰۸) کے عہد سے ہے اور وہ نظیری (۱۳-۱۶۱۲/d۱۰۲۱) طالب آملی (۲۷-۱۶۲۶/d۱۰۳۶) ابو طالب کلیم (۱۶۵۱/d۱۰۶۱) اور صائب (۷۸-۱۶۷۷/d۱۰۸۸) ہیں۔

ابوطالب کلیم: رضا قلی خاں نے ان کا مختصراً ذکر کیا ہے لیکن شبلی نے شعر العجم جلد سوم میں ان پر مفصل بحث کی ہے۔

جو شعرا ہجرت کر کے بغرض منفعت یا تلاش معاش میں ہندوستان آئے تھے ان میں سے زیادہ تر نے بقول شبلی ہندوستان کی مذمت کی ہے لیکن کلیم ہندوستان کا مداح اور افسانہ خواں ہے۔ شبلی نے کلیم کی شاعرانہ خوبیوں پر اشعار کی دلیل کے ساتھ تفصیلی گفتگو کی ہے اور ان خوبیوں مین مضمون آفرینی، خیال بندی اور مثالیہ کی نشاندہی کی ہے۔

پیری رسید و مستی طبع جوان گذشت ضعف تن از تحمل رطل گران گذشت

یہ غزل جسے شبلی نے درج کیا ہے کلیم کے خاص طرز کی مثال ہے اور اسی پر ہم اپنے مختصر جائزے کو ختم کرتے ہیں۔ (جلد چہارم، ص ۶۳-۲۵۰)

صائب: شبلی نے انہیں آخری بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ صائب سب سے بڑے اور معروف ترین جدید شاعر قاآنی سے تخلیقی قوت کی اصالت میں کہیں برتر ہیں بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ فرخی اور منوچہری نے قاآنی کا قالب اختیار کر لیا۔

صائب کے جن شعری خواص کا ذکر شبلی نے کیا ہے وہ ہندوستانی شعرا کے طرز سے مختص ہیں اور ایرانی شعرا کے یہاں خال خال ہیں۔ شبلی نے صائب کی تضمینوں کے ضمن میں ایسے تیرہ اشعار نقل کیے ہیں جن میں اس نے فیضی، ملک، طالب آملی، نوعی، اوحدی، شوقی، فتحی، شاپور، مطیع او جی، ادھم، حاذق اور راقم کے پورے پورے مصرعے مقطعے مین نقل کیے ہیں۔ (جلد چہارم، ص ۶۷-۲۶۵)

صائب نظیری کو صرف اپنے سے نہیں بلکہ عرفی سے بھی زیادہ مانتا تھا یہ کہہ کر براؤن شبلی کی یہ رائے نقل کرتے ہیں۔ ''یہاں تک مضائقہ نہیں بلکہ افسوس ہے کہ عام خوش اعتقادی یا شہرت عام کی بنا پر ظہوری اور جلال اسیر کی بھی مداحی کرتا ہے۔ یہ بد مذاقی کا پہلا قدم تھا جس نے آخر ایک شاہ راہ قائم کردی اور نوبت یہ پہنچی کہ لوگ ناصر علی، بیدل، شوکت بخاری کے کلام پر سر دھنتے ہیں۔ بنیاد ظُلم در جہاں اندک بود ہر کہ آمد بران مزید کرد۔ (۱۷) (جلد چہارم، ص ۲۶۸)

صائب نے ایک بیاض مرتب کی تھی۔ شبلی کے مطابق اس کا ایک قلمی نسخہ حیدر آباد دکن میں ہے۔ والہ داغستانی اور دیگر تذکرہ نگاروں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ شبلی صائب اور ابوتمام میں یہ مماثلت پاتے ہیں کہ عربی شاعری کے اہم انتخاب حماسہ میں مرتب کا جو شعری ذوق جھلکتا ہے خود اس کے دیوان سے ظاہر نہیں ہوتا۔ (جلد چہارم، ص ۷۰-۲۶۹)

براؤن نے شبلی کی شعر العجم سے یہ اشعار نقل کئے ہیں جن میں ظفر خاں سے وطن واپس لوٹنے کی استدعا ہے۔

شش سال پیش رفت کہ از اصفہان بہند افتادہ است تو سن عزم مرا گذار

ہفتاد سالہ والد پیرست بندہ را کز تربیت بود بمنش حق بے شمار

با جبہۂ کشادہ تر از آفتاب صبح دست دعا بدرقۂ راہِ من بر آر

براؤن آٹھ شعر نقل کرنے کے بعد نوٹ میں یہ لکھتے ہیں کہ اگر شبلی کے مطابق یہ اشعار ۳۲-۱۶۳۱/ ۱۰۴۱ میں کہے گئے ہیں تو اس کی رو سے صائب ۲۶-۱۶۲۵/ ۱۰۳۵ میں ہندوستان آیا ہوگا۔ (جلد چہارم، ص ۶۷-۲۶۶)

حواشی

(۱) معلوم نہیں کس حد تک استعداد بہم پہنچائی۔ (۲) Darmesteter کی Etudes Paris 1883,2vol Iraniennes کے مباحث اور موضوعات شعر العجم کے range سے مختلف ہیں۔ (۳) ژند کوئی زبان نہیں ہے بلکہ پہلوی زبان میں اوستا کی تفسیر ہے۔ (۴) شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد اوّل، طبع چہارم، مطبع معارف اعظم گڑھ۔ ۱۹۷۲، ص ۳-۲۔ (۵) نعمانی جلد پنجم، طبع چہارم، مطبع معارف اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۷/ ۱۳۷۷ھ، دیباچہ ص ۱۔ (۶) سخندان فارس ۱۸۷۲ میں مکمل ہوچکی تھی لیکن ۱۸۸۷ میں مطبع کے حوالے ہوئی تھی اور ۱۹۰۷ میں مطبع مفید عام

لاہور سے دونوں حصے ایک ساتھ شایع ہوئے تھے۔ براؤن کی A Literary History of Persia جلد اول ۱۹۰۲ء اور جلد دوم ۱۹۰۶ء میں شائع ہوچکی تھی۔(۷) شعر العجم جلد پنجم طبع چہارم، مطبع معارف، اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۷ء/ ۱۳۷۷، دیباچہ ص ۲۔(۸) تازہ واردوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ سخندان فارس، حیات سعدی اور شعر العجم کی اہمیت کی طرف سے غافل نہ رہین۔(۹) مکتوب بنام چودھری عبدالغفور سرور، جولائی ۱۸۶۳ء، غالب کے خطوط جلد دوم مرتبہ خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔ ۱۹۸۵ء ص ۶۱۴۔ ۶۱۳۔(۱۰) Browne. Edward G, A Literary History of Persia, vol 111, Good word Books, reprinted 2011, p273۔(۱۱) براؤن کے شعر العجم سے استفادہ کی صورت کیا تھی براؤن نے اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا لیکن براؤن کی A year Amongst The Persians میں Denison Ross. Sir E کے "A Memoir" سے کچھ سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے شعر العجم سے استفادہ کا وسیلہ وہ نوجوان طلبہ ہوں جو براؤن سے اسلامی ادبیات پڑھتے تھے۔ سر ڈینی سن راس کے اس بیان کو بھی کہ ہند ایرانی ادبیات اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے براؤن کے تعصب کو ختم کرنے اور اسے نیک خواہشات میں تبدیل کرنے میں شبلی کا بہت اہم رول ہے شبلی کے حق مین براؤن کا خراج عقیدت سمجھنا چاہیے۔(۱۲) شبلی نعمانی، شعر العجم، حصہ پنجم، طبع چہارم، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۵۷ء/ ۱۳۷۷ھ، دیباچہ ص ۳۔ ۲ (شبہہ ہے کہ شبلی نے انگریزی زبان میں اتنی استعداد پیدا کرلی تھی کہ براؤن کی کتاب کو الٹ پلٹ کر بھی دیکھ سکتے)۔(۱۳) شعر العجم حصہ پنجم میں سید سلیمان ندوی کے دیباچہ کے مطابق پہلی جلد ۱۹۰۸ء، دوسری جلد ۱۹۰۹ء اور تیسری ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۷۔۱۹۰۶ء/ ۱۳۲۵ھ تاریخ اختتام تصنیف ''تذکرہ'' کے اعداد ہیں۔ تاریخ اشاعت کی عدم موجودگی میں براؤن نے اسی تاریخ کا حوالہ دیا ہے۔(۱۴) غالباً براؤن نے یہ نتیجہ شبلی کے اس بیان سے اخذ کیا ہے۔ ''یہ تمام واقعات عبدالنبی نے میخانے میں لکھے ہیں اور اس میں اگرچہ خوش اعتقادی اور وہم پرستی نے کچھ باتیں بڑھا دی ہیں یا اصل واقعات کی صورت بدل دی ہے تاہم بہت کچھ اصلی واقعات بھی ہیں''۔(شعر العجم، جلد دوم، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۴۷ء ص ۱۹۲)۔(۱۵) شیخ ابواسحاق انجو، مبارز الدین بن مظفر، شاہ شجاع، شاہ منصور تیمور اور حافظ، ہندوستان آنے کی دعوت سے متعلق واقعات شعر العجم سے ماخوذ ہیں۔(۱۶) کس ایرانی تذکرہ نگار یا سخن شناس کے بیان سے شبلی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے توضیح طلب ہے۔(۱۷) شبلی نے ہندوستانی نژاد شعرا کی لسانی اور شعری کارگزاریوں کو خارج از اعتبار قرار دیا ہے (اور اان سے پہلے غالب نے بھی) اس کا نقصان یہ ہوا کہ ہم اپنی عظیم الشان روایت سے بہت دور چلے گئے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر شور انگیز (چار جلدیں) اور "Stranger in the City: Poetics of Sabk-e-Hindi" میں کلاسکی غزل کی شعریات کی تہوں مین نظریۂ شعر کو بیان کرکے عظمت رفتہ کو ازسر نو قایم کیا ہے۔

عمر خسرو طلب ار نفع جہان می خواھی　　　　که وجودیست عطا بخش کریم نفّاع

شیخ محمد بن عبدالوہاب مولانا مسعود عالم ندوی کی نظر میں

پروفیسر مسعود عالم فلاحی

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ (۱۱۱۵-۱۲۰۶ھ/ ۱۷۰۳-۱۷۹۱ء) کی دعوت اور اصلاح عقائد واعمال کی تحریک نے علم وعمل، فکر وسیاست کے میدان میں ایک عظیم انقلاب برپا کردیا، جیسے ہی ان دعوتی تحریک کے آغاز ہی سے، شرک وبدعات کی خرافات میں کمی آنے لگی اور سنت رسولؐ کی اہمیت اور اس پر عمل کرنے کی کوششیں سامنے آنے لگیں۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ روایتی رسم ورواج کے خلاف آواز بلند کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو کسی کو بھی سماج کا باغی بنا سکتا ہے، جس کی وجہ سے معاندین ومخالفین میں اضافہ اور معاونین وموافقین میں کمی پیدا ہوتی ہے۔ یہ صورت حال سماج کی جہالت، عصبیت اور ضد کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسی ہی صورت حال سے شیخ کی دعوت بھی دوچار رہی۔ بے شمار لکھنے والوں نے اپنے قلم کا سارا زور اور بیان کی ساری توانائی مخالفت میں صرف کردی اور ایسا لگا کہ جھوٹ، بہتان اور الزام تراشی کا ایک سیلاب آ گیا ہے لیکن دوسری طرف وہ بھی تھے جو حق شناس اور حق پسند تھے، انہوں نے شیخ صاحب کی شخصیت اور ان کے فکر اور انداز اصلاح وتربیت کی خوبیوں پر نگاہ کی اور پرزور طریقہ سے ان کی ستائش کی۔

ایسے اصحاب قلم میں مولانا مسعود عالم ندوی (۱۳۲۸-۱۳۷۳ھ/ ۱۹۱۰-۱۹۵۴ء) تھے۔ جنہوں نے اردو زبان میں ''محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح'' (۱) نام سے ایک کتاب

صدر شعبۂ عربی، خواجہ معین الدین چشتی، اردو، عربی فارسی یونیورسیٹی، لکھنؤ۔

۱۳۶۰-۱۳۶۱ھ/۱۹۴۱-۱۹۴۲ء میں تصنیف کی (۲) تاکہ ہندوستانیوں کے ذہن میں شیخ الاسلامؒ کے خلاف جو عصبیت اور غلط فہمی پائی جاتی ہے اس کا ازالہ ہو سکے، نیز لوگوں کے درمیان سچائی اور حقیقت کا انکشاف ہو جائے۔ یہ مولانا مسعود عالم ندوی کی کاوش اور اخلاص کا نتیجہ ہے کہ کتاب کو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور لوگ حقیقت سے روشناس ہوئے اور آج بھی صاحب کتاب کے علم و فضل، دعوت و اخلاص کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ میرا یہ مختصر مقالہ مولانا ندوی کی کتاب اور اس کے مشمولات کا ایک مختصر تجزیہ ہے۔

کتاب: اردو زبان کی یہ واحد کتاب ہے جس میں بارہویں صدی ہجری کے مشہور مصلح اور مجدد شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کی سیرت، اخلاق کریمہ و اوصاف حمیدہ پر تفصیلی اور تحقیقی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسلامی دعوت کے فروغ میں ان کی کامرانی و کامیابی کا ذکر واضح اور مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ نیز اعتراضات و شبہات کا نہایت مدلل انداز میں جواب دیا گیا۔

کتاب کی افادیت کے پیش نظر مولانا عبدالعلیم بن عبدالعظیم بستوی (۳) نے اسے عربی زبان میں منتقل کیا اور اس کا نام "محمد بن عبدالوہاب مصلح مظلوم و مفتری علیہ" رکھا۔ (۴) ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی (۱۴۰۷-۱۳۱۱ھ/۱۹۸۷-۱۸۹۳ء) نے کتاب پر نظر ثانی کی اور مملکت سعودی عربیہ کے وقف بورڈ و رابطہ عامہ نے اس کی طباعت کرائی۔ کتاب مندرجہ ذیل چھ اہم ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول: ذاتی حالات

باب دوم: سیاسی برتری

باب سوم: تصانیف

باب چہارم: دعوت

باب پنجم: غلط بیانیاں اور افتراپردازیاں

باب ششم: ماخذ اور لٹریچر

پہلا باب: پہلے باب میں مصنف نے مسلمانوں کے دور عروج پر بحث کی ہے۔ شواہد و دلائل کی روشنی میں جزیرۃ العرب کی دین حنیف والی خصوصیات اور شرک و بدعات سے بیزاری کا نقشہ کھینچا ہے۔ پھر شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ کی ولادت کے وقت عالم اسلام کی حالت کا تذکرہ کیا

ہے۔اس کے بعدان کی ولادت، پرورش و پرداخت، دعوتی مشاغل پھران کی خصوصیات پر مدلل انداز میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔مزید اولاد اور خاندان کے سلسلے میں بھی معلومات ہیں۔

مصنف، شیخ الاسلام کی ولادت کے وقت عالم اسلام کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ''بالآخر جب دنیا پھر تاریکی میں مبتلا ہوگئی، مسلمان کتاب وسنت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے، ایک اللہ کی جگہ سینکڑوں معبود بنا لئے گئے، مصر میں بدوی و رفاعی (۶)، عراق و ہند میں عبدالقادر جیلانی (۷)، مکہ و طائف میں ابن عباسؓ (۸)، یمن میں ابن علوان (۹)، سے مرادیں مانگی جانے لگیں (۱۰) اور مسلمان ہر شجر و حجر کے آگے جھکنے لگے، جب یہ حالت ہوگئی تو اسی بے آب و گیاہ سرزمین پر پہلے پہل تذکیر و ہدایت کا آفتاب ضوفگن ہوا اور خاک عرب کے وہ ذرے جو جہل و شرک کی طغیانی کے باعث ماند پڑ گئے تھے، پھر چمک اٹھے، اور نجد کے چمنستان سے جو اپنے عرار و خزامی (۱۱) کی عطر بیزی کے لئے مشہور ہے، توحید و کلمہ حق کی ایسی خوشبو پھیلی جس نے تمام عالم کو زعفران زار بنا کر چھوڑا۔ میری مراد شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب (رحمه الله و نور ضريحه (ان پر اللہ کی رحمت ہو اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے) کی ذات گرامی سے ہے، جنھوں نے اپنی مسلسل اور انتھک کوششوں سے توحید کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، اور جہاں تک اس مردِ مجاہد کی آواز پہونچ سکتی تھی، اس نے حق و صداقت کا پیغام پہنچایا۔'' (۱۲)

دوسرا باب: دوسرا باب خاندان آل سعود کے ذریعے جو عظیم اصلاحات اور احسانات کئے گئے ان پر مشتمل ہے۔مصنف نے اس عظیم دعوت کے معاونین و مشارکین کا تذکرہ کیا ہے، اور ان میں سے چار کا ذکر بطور خاص کیا ہے: ملک محمد بن سعود (۱۷۱۰-۱۷۶۵ء)، ملک عبدالعزیز بن محمد سعود (۱۷۲۱-۱۸۰۳ء)، ملک سعود بن عبدالعزیز (۱۷۵۹-۱۸۱۴ء)، اور ملک عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز (۱۸ر صدی-۱۸۱۸ء)۔ ان بادشاہوں نے شیخ الاسلام کی دعوت سے اتفاق اور ان کے ساتھ جو لطافت و سخاوت کا برتاؤ کیا اس پر بھی روشنی ڈالی گئی۔

مصنف نے امراء کی جانب سے کیے گئے تعاون کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''شیخ کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد نجد اور اطراف نجد میں جو خوشگوار تبدیلیاں ہوئیں، وہ سب ثمرہ تھیں شیخ الاسلام کی ''دعوت'' اور ان کے اخلاص کا۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ نے اہل نجد کی زندگی، عقائد اور اخلاق میں ایک غیر معمولی انقلاب نہیں، بلکہ کایا پلٹ کر دی۔ خوش قسمتی سے انھیں محمد بن سعود (متوفی ۱۱۷۹ھ/ ۱۷۶۵ء) عبدالعزیز بن محمد بن سعود (۱۱۷۹-۱۲۱۸ھ/ ۱۷۶۵-۱۸۰۳ء) اور سعود ابن عبدالعزیز (۱۲۱۸-۱۲۲۹ھ/ ۱۸۰۳-۱۸۱۶ء) جیسے اولوالعزم مجاہد اور فرمانروا ملے، جنھوں نے شیخ کے مشن کی تکمیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

شیخ کی دعوت کے ساتھ ساتھ آل سعود کا نام بھی وابستہ ہو گیا۔ اس لئے ہم مختصر طور پر آل سعود کی تاریخ کے ان اہم حصوں کو پیش کر دینا چاہتے ہیں، جن کا اس تحریک سے خاص اور بلاواسطہ تعلق ہے۔'' (۱۳)

تیسرا باب: تیسرا باب شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ کی تصانیف کے ساتھ خاص ہے اور اس باب میں مصنف نے شیخ الاسلام کی تصانیف ان کی خصوصیات، طریقہ کلام اور اسلوب تحریر پر مفصل روشنی ڈالی ہے اور ان کی کل پندرہ تالیفات شمار کرائی ہیں، ان کی کتاب کو جو مقبولیت عام ملی ان کا بھی ذکر ہے۔ مصنف ان کی تالیفات کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''ان کی تصنیفات کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان پر یونان اور یونانی علوم کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں پڑی، ہمارے یہاں ہندوستان کے بڑے سے بڑے مجددین امت کی کتابیں یونانی گورکھ دھندے سے یکسر پاک نہ رہ سکیں۔ شیخ کا طریقہ، بالکل قرآنی ہے اور ان کی دلیلیں جزء وکل قرآن وحدیث سے ماخوذ ہوتی ہیں۔

دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں تصوف کی اصطلاحات بھی ناپید ہیں، ویدانت اور نوافلاطون فلسفہ کے اس معجون مرکب نے (جس کا نام لوگوں نے تصوف رکھ چھوڑا ہے) اس کی بنیادیں کھوکھلی کر ڈالیں۔'' (۱۴)

چوتھا باب: چوتھا باب شیخ کے دعوتی نقطہ نظر اور اس کی حقیقت پر مشتمل ہے اور سیاسی و مذہبی

اغراض ومقاصد کے تحت جو شیخ الاسلامؒ پر بہتان تراشی وافترا پردازی کی گئی ان کا بھی ذکر ہے۔ان کے فقہی موقف اور عقائد کا ذکر اور تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں ان کا خاص طور پر ذکر بھی ملتا ہے۔مثلاً:

غیر اللہ کو پکارنا (مصیبتوں میں غیر اللہ کو پکارنا)۔

استغاثہ (غیر اللہ سے فریاد چاہنا)۔

توسل (وسیلہ)۔

استعاذہ (پناہ چاہنا)۔

الحلف بغیر اللہ (غیر اللہ کی قسم)۔

زیارۃ قبور (قبور پر حاضری)۔

مصنف نے اس بات کو واضح انداز میں ثابت کیا ہے کہ ان کی دعوت صرف کتاب وسنت پر مبنی تھی اور مخالفین کی آواز تعصب،سیاسی مفاد اور دیگر پروپیگنڈہ کے تحت تھی،رقم طراز ہیں:

> ''شیخ الاسلام کی دعوت جسے 'وہابیت'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے،کوئی نئی چیز نہیں ہے،(بلکہ) کتاب وسنت کی صحیح تعلیم کے سوا،وہ اور کچھ نہیں پیش کرتے ہیں؛لیکن سیاسی اغراض کے ماتحت شیخ کی دعوت کو'وہابیت' کا نام دے کر اس طرح پیش کیا گیا جیسے اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کی دعوت دی جارہی ہو۔''(۱۵)

مزید لکھتے ہیں:

> ''آج سے تیس چالیس برس پہلے،ان غلط الزامات کو قبول کرنے کی کوئی توجیہہ کی جاسکتی تھی۔اہل نجد کی کتابیں عام طور پر نہیں ملتی تھیں اور خود علمائے نجد اپنے محدود علاقہ سے باہر تبلیغ واشاعت پر بہت کم توجہ کرتے تھے،اس لئے اس وقت یہ بہت ممکن تھا کہ کوئی شخص سچائی کے ساتھ ان کے متعلق غلط رائے رکھتا ہو؛لیکن آج جب کہ شیخؒ اور ان کے شاگردوں کی تصنیفات چھپ کر عام ہوچکی ہیں،(تو) لاعلمی کا عذر مسموع نہیں ہوسکتا۔''(۱۶)

باب پنجم: اس باب میں مصنف نے ان بہتانوں اور الزام تراشیوں کا ذکر کیا ہے جو ان کے

اوپر عائد کئے گئے تھے۔ان کا جواب بھی دلائل و براہین کی روشنی میں دیا گیا۔جیسے:

وہابیت (یعنی شیخ کی دعوت خالصہ کو وہابیت کا نام دینا)۔ ادعائے نبوت (نبوت کے دعوے کا بہتان)۔انکارِحدیث (انکارِحدیث کا الزام)۔تکفیر و قتال مسلمین (مسلمانوں کی تکفیراوران سے جنگ کے جواز کا الزام)۔عام غلط بیانی (دیگر بہت سے جھوٹ)۔انہدام قبہ نبوی (نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ اطہر کے انہدام کا بہتان)۔

مصنف اس قسم کی افترا پردازی کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ''شیخ اوران کے ماننے والوں کے متعلق طرح طرح کی بے بنیاد باتیں شروع سے ہی کہی جانے لگی تھیں۔شیخ الاسلام کے صاحبزادے شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب (۱۷) کے اس رسالے میں بھی جو انھوں نے ۱۲۱۸ھ/ ۱۸۰۳ء میں اہل مکہ کے لئے لکھا تھا اس قسم کی غلط بیانیوں کی تردید کی گئی ہے''۔(۱۸)

اس ضمن میں مصنف نے شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب کی ایک یہ عبارت بھی نقل کی ہے، جو مندرجہ ذیل ہے:

واما ما يكذب علينا ستر الحق .... بأنا نفسر القرآن برأينا و نأخذ من الحديث ما وافق فهمنا.... وأنا نضع من رتبة نبينا صلى الله عليه وآله وسلم بقولنا: النبي رمة في قبره وعصا أحدنا أنفع منه وليس له شفاعة وأن زيارته غير مندوبة.... وأنا مجسمة وأنا نكفر الناس على الاطلاق ... فجميع هذه الخرافات و أشباهها .... كان جوابنا في كل مسألة من ذالك سبحانك هذا	اور یہ جو حق پوشی کی راہ سے ہمارے متعلق جھوٹ جھوٹ کہا جاتا ہے..کہ ہم قرآن مجید کی تفسیر اپنے رائے سے کرتے ہیں اور حدیث نبوی سے اسی قدر لیتے ہیں جو ہمارے فہم (اور ذوق) کے مناسب ہو... اور یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان گھٹانے کے لیے 'النبی رمة فی قبرہ' (نبی کریمؐ قبر میں ایک بوسیدہ ہڈی سے زیادہ نہیں) اور عصا أحدنا أنفع منه (ہم سے کسی ایک کی چھڑی ان سے زیادہ نفع بخش ہے) جیسے (گستاخانہ) فقرے کہا کرتے ہیں، اور یہ کہ رسول کریمؐ کو شفاعت کا حق نہیں ہوگا، اور یہ کہ قبر اطہر کی زیارت مستحب نہیں ہے..اور یہ کہ ہم تجسیم کے قائل

بھتان عظیم۔

ہیں اور یہ کہ ہم تمام لوگوں کی علی الاطلاق تکفیر کرتے ہیں... تو ان سب اور ان جیسی دوسری بے سروپا باتوں میں سے ہر ایک کے متعلق ہمارا جواب 'سبحانک هذا بهتان عظیم' (اللہ کی ذات قابل تعریف ہے، یہ تو عظیم بہتان ہے) کے سوا کچھ بھی نہیں۔" (۱۹)

چھٹا باب: اس باب میں تاریخی حوالوں سے مصادر و مراجع کا ذکر کیا ہے، اس سلسلے میں ۳۸ تاریخی، اور ۲۴ مذہبی کتابوں و مراجع کا تذکرہ کیا جو بعض عربی، بعض اردو اور بعض انگلش زبان میں ہیں، اور ان کا مختصر تعارف بھی کروایا ہے۔

مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب اصحاب علم کی نظر میں: شیخ عبداللہ بن عبدالمحسن ترکی (۲۰)۔

"اس دعوت و تحریک کو انحائے عالم کے مورخین، مفکرین، محققین اور مصنّفین نے مختلف زبانوں میں موضوع بحث بنایا۔ چنانچہ بعض نے اللہ کی توفیق سے کسی جانب داری اور تعصب کے بغیر اسے گلے لگالیا، تو بعض نے خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہوئے اس دعوت اور اس کے متبعین پر بہتان، افترا پردازی کی اور بہت سی ایسی بے بنیاد باتیں شیخ کے جانب منسوب کردیں جو کبھی آپ کی زبان پر نہیں آئیں۔ دشمنان اسلام اور بدعتی مسلمانوں کی جانب سے شیخ اور ان کی دعوت پر بہتان تراشی، افترا پردازی کی کثرت کے باوجود اللہ نے ایسے لوگوں کو تیار کیا جو ان افترا پردازی اور جھوٹ کا مقابلہ کریں، اور اس کی گمرہی کو حجت، دلائل اور قول فیصل سے واضح کریں۔

اس دعوت کے متعلق الزام تراشیوں، بہتان بازیوں اور جھوٹ کی قلعی کھولنے والی کتابوں میں سے ایک اہم اردو کتاب مولانا مسعود عالم ندویؒ کی ہے۔ اس میں انہوں مختلف زبانوں میں شیخ کی دعوت کی خلاف موجود سیکڑوں مسائل کو جمع کر کے ان کا محققانہ جائزہ بغیر کسی جانب داری اور تعصب کے لیا ہے۔ اللہ کی دی ہوئی توفیق اور وسعت علم کی روشنی میں انہوں نے دلائل و براہین اور مسلم وغیر مسلم کے آراء کی روشنی میں اس دعوت کے خلاف تمام تر الزامات و بہتان، جھوٹ اور پروپیگنڈہ کا قلع قمع کردیا۔ اس عظیم کتاب کے مضامین عربی داں طبقہ تک پہوچانے کے لئے مولانا عبدالعلیم بن عبدالعظیم بستوی نے اپنی محنت سے اس کو عربی زبان میں منتقل کردیا تا کہ کتاب کی افادیت و منفعت

طالب علم وراہ حق کے متلاشی کے درمیان عام ہو، اور دور حاضر کے داعیان اسلام کی نظر میں آشکارا ہوجائے کہ حق وہدایت کا ایک ہی راستہ ہے۔ جس کا دفاع ہر زمانہ میں اور ہر جگہ کے مخلص مسلمان، صلہ وستائش کی پرواہ کیے بغیر، صرف عقیدہ کے تحفظ کی بنیاد پر، حق کی مدد اور اپنے فریضہ کی ادئیگی کے جذبہ سے کرتے رہے ہیں، یقیناً انہیں اس کا اجر اللہ کی طرف سے ملے گا۔ ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی (جزاہ اللہ خیر الجزاء۔ اللہ انہیں بہترین بدلہ دے) نے اس کتاب کی اشاعت کے وقت ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۶ء میں اسے دیکھا اور اور اس کے لئے مقدمہ لکھا۔

اشاعت اول کی ایک مدت کے بعد جامعہ نے اس ضرورت محسوس کیا کہ مؤلف اور مترجم سے متعلق بعض ملاحظات کی تصحیح کے بعد اس کتاب کو دوبارہ شائع کیا جائے۔ چنانچہ اسے شیخ اسماعیل انصاری (۱۳۴۰۔۱۴۱۷ھ) اور شیخ عبدالعزیز رومی کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان دونوں حضرات نے اس کی قابل قدر مراجعت کی اور بعض لغزشیں جو پہلی اشاعت میں رہ گئی تھیں، ان کی جانب توجہ مبذول کرائی۔ اللہ ان کی کاوشوں کا بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ ان کی وجہ سے کتاب بہترین علمی انداز میں دوبارہ منظر عام پر آئی۔

صاحب دعوت سے وفاداری نبھانے، واجب کی ادائیگی نیز دعوتی امور سے دلچسپی رکھنے والے ایک مرکزی اسلامی ادارہ کی حیثیت سے جامعہ نے اس کتاب کا نیا ایڈیشن شائع کیا، اس امید کے ساتھ کہ اللہ تعالی اس عمل کو قبول کرے اور اس کے عمل کو اپنی خوشنودی کا ذریعہ بنائے، اور عامۃ المسلمین کو اس کا فائدہ پہونچائے، وہ سننے والا اور قبول کرنے والا۔ اللہ ہمارا ولی ہے اور وہ بہترین ولی اور مددگار ہے۔ (۲۱)

۲۔ شیخ علامہ ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی: اللہ نے میرے شاگرد رشید، ادیب کبیر مسعود عالم ندوی کو اس بات کی توفیق دی کہ وہ اس مشکل عمل کو انجام دیں۔ انہوں نے اس میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ یہ کامیابی انھیں مختلف زبانوں کی ستر کتابوں کے عمیق مطالعہ کے بعد نصیب ہوئی، انہوں نے عقیدہ کے اہم مسائل کا استخراج بھی کیا۔

دعوت وارشاد اور آل سعود اور ان کے دشمنوں کے درمیان ہونے والے جنگ وجدال اور فتح و شکست کی ابتدا سے تاحال کی مختصر تاریخ اس انداز میں پیش کی ہے کہ نہ تو اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے اور نہ

ذہن پر گراں بار لگتی ہے۔مزید براں یہ کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی دینی و دنیاوی فتح کی تاریخی جھلکیاں بھی پیش کی ہیں۔اور بہت سے ایسے مسائل جن میں مورخوں کے مابین شدید اختلاف تھا ان کو میزان اعتدال پر ایسے پرکھا کہ حقیقت دو دو چار کی طرح واضح ہوگئی اور دشمنوں کی افترا پردازی کی تردید دلیل و برہان کی روشنی میں، مسلم اور غیر مسلم چشم دید گواہوں کے بیانات کے ذریعے کی۔

''خوبصورت عورت تو وہ ہے جس کی سوتن بھی، اس کی خوبصورتی کی گواہی دے اور خوبی تو وہ ہے جس کا اعتراف دشمن بھی کرنے پر مجبور ہو جائیں''۔

میں اس بات سے واقف تھا کہ میرے شاگرد مسعود عالم ندوی نے یہ کتاب لکھی ہے، جس کا نام انہوں نے ''محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح'' رکھی ہے؛ لیکن جب تک یہ اردو زبان میں تھی میری نظر سے نہیں گذری، اور مجھے اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ علم و تحقیق کے میدان میں اس حد تک پہنچ گئے ہیں۔جب میں نے اسے پڑھا تو بے ساختہ میری زبان سے یہ نکلا ''ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء'' (یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے)۔

یقیناً مسعود عالم ندوی نے بہت پہلے اس کتاب کے ذریعہ اردو داں طبقہ کے لیے ایک بہترین تحفہ پیش کیا، اور دوسرے لوگ اس سے محروم رہے، حالانکہ حق کے متلاشی تمام لوگوں کو اس کی سخت ضرورت ہے۔ان کے لیے یہ بہت مشکل بلکہ ناممکن امر ہے کہ وہ ان تحقیقی مسائل کو۔جیسا کہ وہ ہیں۔ایک ایسی کتاب میں اکٹھا پائیں جو صرف دو سو صفحہ پر مشتمل ہو۔بہر حال اس کتاب کی تکمیل میں سب پہلے اللہ کا فضل ہے، پھر مسعود عالم ندوی کا، ندوۃ العلماء میں مجھے درس و تدریس کے لیے سید سلیمان ندویؒ (۱۳۰۲۔۱۳۷۳ھ/ ۱۸۰۶۔۱۹۵۳ء) اور ڈاکٹر عبدالعلیؒ نے مدعو کیا تھا، میں وہاں ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء کے اوائل سے شعبان ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء تک مقیم رہا۔اس ادارہ میں مسعود عالم ندوی میرے بہترین تلامذہ میں سے تھے، میں نے مسعود عالم کی طرح محنتی اور حصول علم کا پیاسا کسی کو نہ پایا۔اسی طرح وہ اپنی دینداری میں مخلص، بااخلاق اور صاحب عزیمت تھے، حق کے سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

انہوں نے اس مدت میں مجھ سے جو حاصل کیا تھا اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ہندوستان سے

سفر کر کے بغداد تشریف لائے اور میرے پاس ایک سال تک قیام کیا، اسی طرح انہوں نے استاد عاصم الحداد کی بھی صحبت اختیار کی۔ وہ مسجد اور میرے گھر میں میرے درس میں حاضر رہتے تھے۔ میں نے ان کے اندر کوئی عیب نہیں دیکھا سوائے حنفی مذہب کے تعصب کے۔ وہ اس سلسلے میں میرا، احترام ملحوظ رکھتے ہوئے مجھ سے اختلاف کرتے تھے۔ (۲۲)

خاتمہ: خلاصہ یہ ہے کہ شیخ کی دعوت، اس کے اہداف اور اس کے خلاف بہتانوں کی حقیقت بیانی کے سلسلے میں یہ کتاب ایک مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ حالانکہ مولف کتاب اور شیخ کے درمیان نسبی یا وطنی رشتہ نہیں ہے پھر بھی انہوں نے دعوت اور اصحاب دعوت سے دور رہ کر، یہ کتاب صرف حق کی مدد اور ایک فریضہ کی تکمیل کے لیے لکھی ہے، اور زیر بحث مسائل میں انصاف کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔

مولف کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تردید اور ان کی سیرت و دعوت پر طعن و تشنیع کے موضوع پر لکھی گئی بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا، اسی طرح ان مذکورہ کتابوں کے رد اور دعوت اور صاحب دعوت کے دفاع میں لکھی جانے والی کتابیں پڑھیں۔ اس لیے انہوں نے صحیح اور مثبت رائے قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی، اور ایسا بہت کم ہی لوگ کر پاتے ہیں۔

حواشی

(۱) دار الاشاعۃ نشاۃ ثانیۃ، حیدرآباد، دکن، مطبوعۃ: صحیفہ برقی مشین پریس، حیدرآباد دکن، اشاعت اول: مارچ ۱۹۴۶ء۔ (۲) حوالہ سابق ص ا۔ (۳) ۱/۱/۱۹۴۹ء میں اکرہرا گاؤں ضلع بستی (موجودہ سدھارتھ نگر)، ریاست اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ اور یہ گاؤں جنوبی نیپال سے ۷ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ اوان کی نسبت ان کے ضلع "بستی" کی طرف کی جانے کی وجہ سے انہیں "بستوی" کہا جاتا ہے۔ ۱۳/ جون ۲۰۱۶ء کو مدینہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ (۴) من مطبوعات وزارۃ الشؤون الاسلامیۃ، الاوقاف، ۱۴۲۰ھ (۱۹۹۹ء)۔ (۵) احمد بن علی بن یحیٰ (فاس ۵۹۶ھ/۱۱۹۹ء۔ طنطا ۶۷۵ھ/۱۲۷۶ء) سنی عربی صوفی امام تھے۔ متصوفین کے نزدیک ۴ قطبوں میں سے تیسرے نمبر پر تھے اور ان کی طرف سرخ جھنڈے والی بدوی طریقت کو منسوب کیا جاتا ہے۔ ان کے بدوی لقب کی وجہ یہ

ہے کہ وہ گاؤں کے لوگوں کی طرح ہمیشہ اپنے چہرے پر پردہ لٹکائے رہتے تھے۔ان کے بہت سارے القاب ہیں، لیکن سب سے زیادہ مشہور'' شیخ العرب'' اور'' السطوحی'' ہے۔(۶) احمد الرفاعی صوفی اشعری شافعی فقیہ (۵۱۲۔۵۷۸ھ/ ۱۱۱۸۔۱۱۸۲ء) ہیں۔''ابوالعلمین''،'' شیخ الطرائق''،''الشیخ الکبیر''اور''استاذ الجامعۃ'' جیسے القاب سے بھی جانے جاتے ہیں۔ان کی طرف صوفیوں کا طریقۂ رفاعی بھی منسوب کیا جاتا ہے اور صوفیوں کے مشہور قطبوں میں سے ایک تھے۔(۷) عبدالقادر جیلی یا جیلانی یا کیلانی (۴۷۰۔۵۶۱ھ/ ۱۰۷۷۔۱۱۶۵ء) نام ابومحمد عبدالقادر بن موسی بن عبداللہ ہے۔مشرق میں وہ شیخ بوعلام جیلانی سے معروف ہیں تو مشرق میں عبدالقادر جیلانی کے نام سے۔وہ سلطان الاولیاء کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔وہ صوفی امام اور حنبلی فقیہ ہیں، ان کے متبعین نے ان کو''باز اللہ الاشہب''،''تاج العارفین''،''محی الدین''اور''قطب بغداد'' جیسے القاب سے نوازا ہے۔انہیں کی طرف صوفی قادریہ سلسلہ منسوب کیا جاتا ہے۔(۸) عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم ۶۱۸۔۶۱۹۔۶۸۷ء) جلیل القدر صحابی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد بھائی، امت کے چیدہ اور فقیہ امام تفسیر، اور ترجمان القرآن ہیں۔وہ بنی ہاشم میں ہجرت سے ۳سال قبل پیدا ہوئے۔ان کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ دعا فرماتے تھے۔ایک مرتبہ دعا کی کہ اللہ ان کو علم سے بھر دے اور صالح بنا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو اپنے سے قریب رکھتے تھے اور بچپن میں انہیں اپنے کندھوں پر اٹھاتے اور یہ دعا کرتے تھے: اللھم فقہہ فی الدین وعلمہ التاویل۔(اللہ اسے دین میں تفقہ دے اور تفسیر سکھادے)(۹) احمد بن علوان (ت ۶۶۵ء) یمن میں دولت رسولیہ کے زمانے میں صوفیہ اور ان کے فلاسفیوں کے امام تھے۔حکومت اور علم کے گود میں پرورش پائی۔ان کے والد بادشاہ کی ملازمت اور اس کا تبوں میں سے تھے۔اپنے والد کے طریقے کو اختیار کرتے ہوئے ان کو بادشاہ کی ملازمت اختیار کرنی تھی، مگر انہوں نے تصوف کو اختیار کیا اور گوشہ گیر ہو کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔وعظ و نصیحت کی وجہ سے وہ مشہور تھے۔وعظ میں انہوں نے ابن جوزی کے طریقۂ کو اپنایا، یہاں تک کہ ان کو جوزی الیمن کا لقب ملا۔کئی جلدوں میں ان کے بہت سے رسائل اور مولفات، جن میں سے ایک کتاب''الفتوح المصونۃ والاسرار المخزونۃ'' ہے۔مزید ان کا دیوان شاعری بھی ہے جس میں مسائل تصوف کا غلبہ ہے۔ان کی وفات کے بعد ان کی قبر مقدس مقام بن گئی اور ہر سال ربیع الاول میں ان کے سالانہ عرس کا انعقاد کیا جاتا ہے جس کو تاریخ میں ''یوم الجمع المبارک'' کہا جاتا ہے۔(۱۰) تطہیر الاعتقاد عن أدران الالحاد للامیر محمد بن اسماعیل الیمنی الصنعانی (مصر ۱۳۴۰ھ) ص ۲۔۵، نقلا عن ندوی، مسعود عالم: محمد بن عبدالوھاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح، op.cit، پہلا باب: ذاتی حالات، ص ۱۲، حاشیہ:۱، الندوی، مسعود عالم: محمد بن عبدالوھاب مصلح مظلوم ومفتری علیہ، op.cit، ص ۲۶، حاشیہ

:ا۔(۱۱) نجد کے عرار وخزامی، رند کا ذکر کلام عرب میں بکثرت آتا ہے، محمود شکری آلوسی (م ۱۳۴۲ھ) ۱۲۷۳۔ ۱۳۴۲ھ/ ۱۸۵۶۔ ۱۹۲۴) اسی قبیل کی مختلف ابیات ''تاریخ نجد'' کے ص ۸۔۹ میں ذکر کیا ہے۔(القاہرۃ ۱۳۴۳ھ/ ۱۸۲۷ء) نقلاً عن ندوی، مسعود عالم : محمد بن عبد الوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح، op.cit، ص ۱۲، حاشیہ:۲، الندوی، مسعود عالم: محمد بن عبدالوہاب مصلح مظلوم ومفتری علیہ، op.cit، ص ۲۶، حاشیہ ۲۔(۱۲) ندوی، مسعود عالم: محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح، op.cit، ص ۱۱۔۱۲، الندوی، مسعود عالم: محمد بن عبدالوہاب مصلح مظلوم ومفتری علیہ، op.cit، ص ۳۲۔ ۳۳۔ (۱۳) حوالہ سابق، (اردو)، دوسرا باب: سیاسی برتری، ص ۵۵، (عربی)، ص ۹۱۔(۱۴) حوالہ سابق، (اردو)، تیسرا باب: تصانیف، ص ۱۲۷، (عربی)، ص ۱۵۹۔(۱۵) حوالہ سابق، (اردو)، چوتھا باب: دعوت، ص ۱۳۶، (عربی)، ص ۱۷۵۔(۱۶) حوالہ سابق، (اردو)، ص ۱۳۸، (عربی)، ص ۱۷۶۔ (۱۷) ۱۱۶۵۔ ۱۲۴۲ھ/ ۱۷۵۱۔ ۱۸۲۶ء۔(۱۸) ندوی، مسعود عالم: محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح، op.cit، پانچواں باب: غلط بیانیاں وافترا پردازیاں، ص ۱۷۸۔۱۷۹، الندوی، مسعود عالم: محمد بن عبدالوہاب مصلح مظلوم ومفتری علیہ، op.cit، ص ۲۱۳۔(۱۹) الهدیۃ السنیۃ، (مجموعۃ الهدیۃ السنّیۃ والتحفۃ الوہابیۃ النجدیۃ، ترتیب: سلیمان بن سحمان النجدی، مصر، ۱۳۴۲ھ)، ص ۴۶، بحوالہ سابق، (اردو)، op.cit، ص ۱۷۹۔۱۸۰، (عربی)، ص ۲۱۳۔(۲۰) (ولادت ۱۹۴۰ء)۔(۲۱) الندوی، مسعود عالم: محمد بن عبدالوہاب مصلح مظلوم ومفتری علیہ، op.cit، ص ۱۰۔(۲۲) حوالہ سابق op.cit، ص ۱۰۔۱۱۔

مصادر ومراجع

۱۔ندوی، مسعود عالم: محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح (دارالاشاعۃ نشاۃ ثانیۃ، حیدرآباد، دکن، مطبوعۃ: صحیفہ برقی مشین پریس، حیدرآباد، دکن، اشاعت اول: مارچ ۱۹۴۶ء)۔

۲۔الندوی، مسعود عالم: محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح، الترجمۃ العربیۃ: عبدالعلیم عبدالعظیم البستوی: محمد بن عبدالوہاب مصلح مظلوم ومفتری علیہ، (من مطبوعات وزارۃ الشوون الاسلامیۃ، الاوقاف، ۱۴۲۰ھ (۱۹۹۹ء)۔

۳۔https://ar.wikipedia.org/wik

اخبار علمیہ

''خزانۃ القیروانیہ کی تجدید اور اس کا افتتاح''

مراکش کے شہر فاس میں اس نام سے ایک قدیم کتب خانہ جس کی بنیاد فاطمہ الفہری نے ۸۵۹ء میں رکھی تھی اور اس کے لیے اس نے اپنی وراثت میں ملنے والی پوری جائیداد وقف کردی تھی۔ اس میں نایاب ونادر مذہبی وفلسفیانہ کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے جو آج تک استفادہ کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ گرمی کی شدت کے سبب جب تین سال قبل اس کی حالت ابتر ہوئی تو وزارت ثقافت نے کنیڈا کے ماہر فن تعمیر عزیزہ چونی کے زیر نگرانی اس کی مکمل تجدید کاری کا بیڑا اٹھایا۔ منتظمین نے تجدید کاری کے عمل کے دوران اس بات کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی کہ اس کی قدیم ہیئت اور شان وعظمت باقی رہے۔ حفاظتی نقطہ نظر سے اس میں شمسی پینل، نیا گٹر نظام، موسم اور نمی کو کنٹرول کرنے والے آلات نصب کرنے کا مزید اہتمام کیا گیا ہے تاکہ کتب خانہ میں موجود تقریباً چار ہزار اہم مخطوطات اور خود کتب خانہ کی عمارت محفوظ رہے۔ اس کے علاوہ ایک جدید ترین لیباریٹری کا اس میں اضافہ بھی کیا گیا جس میں ہمہ وقت موجود عملہ مخطوطات کو ڈیجیٹائزڈ کرنے میں مصروف رہے۔ روایتی تالا چابی کے بجائے اپ گریڈ کمپیوٹرائزڈ سلامتی نظام کا اہتمام بھی پیش نظر ہے۔ (تعمیر فکر، بنگلور، ستمبر۔ اکتوبر ۲۰۱۶ء)

''تعارف اسلام پر مشتمل انسائیکلوپیڈیا''

اسلامی تعلیمات سے ناآشنا لوگوں اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کے مقصد سے ماڈرن گائیڈ فاؤنڈیشن ریاض نے عالمی سطح پر ''المسلم الجدید'' نام سے ایک پروجیکٹ کا اعلان کیا ہے۔ اس کے تحت ایک ایسی انسائیکلوپیڈیا تیار کرائے جائے گی، جس میں اسلام کے تقریباً تمام موضوعات پر کتابوں کا احاطہ کیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ متعلقہ مفید ویب سائٹ بھی ہوں گی جن کے ذریعہ اسلام کو حقیقی شکل میں پیش کرنے اور اسلام سے متعلق ذرائع ابلاغ کے ذریعہ پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش کی جائے گی۔ اس کے متعلق تشفی بخش جواب دیا جائے گا۔ رپورٹ کے مطابق یہ انسائیکلوپیڈیا بیک وقت دنیا کی ۵۰ زبانوں میں پیش کی جائے گی۔ اس کے ڈائریکٹر شیخ خالد الاحمدی

نے اس علمی پروجیکٹ کی تکمیل کے سلسلہ میں ارباب علم و دانش سے تعاون اور اپنے قیمتی آرا سے نوازنے کی درخواست کی ہے۔(صراط مستقیم، برمنگھم، اکتوبر ۲۰۱۶ء)

"اسٹیفن ہاکنگ کا انتباہ اور جل ٹارٹر کا اس سے اختلاف"

خلا سے آنے والے پراسرار سگنلز کی تحقیق میں ایک عرصہ سے ہمارے سائنس داں مصروف ہیں لیکن مشہور سائنٹسٹ اسٹیفن ہاکنگ کا ان کے متعلق یہ خیال ہے کہ خلائی مخلوق کے پیغامات اگر موصول ہو بھی جائیں تو ان کا جواب ہرگز نہ دیا جائے کیونکہ اس کا انجام بہت خطرناک ہوسکتا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ مخلوق یقیناً انسانوں کے بالمقابل زیادہ ذہین وفطین اور ترقی یافتہ ہے اور وہ انسانوں کو غلام بنانے کی کوشش کرے گی اور اس کا نتیجہ خلائی مخلوق کے حملہ کی صورت میں نکلے گا۔اس قضیہ میں انہوں نے امریکہ اور کولمبس کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ جب کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تو ریڈ انڈین قبائل کے حق میں اس کے اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے۔انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا اور آہستہ آہستہ وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ان کے اس خیال کے برعکس سیتی انسٹی ٹیوٹ کی سابقہ ڈائریکٹر جل ٹارٹر کا کہنا ہے کہ اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی خلائی مخلوق ہم سے ترقی وذہانت میں لاکھوں برس آگے ہے تو وہ یقیناً تہذیب اور امن پسندی میں بھی ہم سے بہتر ہوگی اور عین ممکن ہے کہ غلام بنانے کے بجائے وہ ہماری مددگار و دوست ثابت ہو۔ (تفصیل میل آن لائن میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے)

"دیوار گیر کھیت"

بے وزن ماحول میں کم سے کم جگہ کا استعمال کرتے ہوئے پھل اور سبزیاں اگانے کے تجربات امریکی خلائی ادارہ "ناسا" نے بہت پہلے کرلیے تھے۔ان ہی تجربات کو پیش نظر رکھ کر ایک امریکن کمپنی نے ایسی ٹیکنالوجی وضع کی ہے جس کی مدد سے ایسی الماریاں تیار کی گئی ہیں جن میں روز مرہ استعمال کی سبزیاں اور سلاد وغیرہ بہ آسانی اگائی جاسکتی ہیں۔اسی مناسبت سے ان الماریوں کو "وال فارمز" یعنی دیوار گیر کھیت کا نام دیا گیا ہے۔ان مختصر کھیتوں کی تیاری میں نینو ٹیکنالوجی کی مدد سے ایسے مادے تیار کیے گئے ہیں جو پودوں کو ضرورت کے مطابق پانی، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور

دوسرے اہم غذائی اجزا کی مطلوبہ مقدار فراہم کرتے رہتے ہیں۔رپورٹ کے مطابق وال فارمز میں اگائی گئی سبزیوں میں وٹامن (حیاتین) کی مقدار زیادہ ہوتی ہے اوروہ مٹی میں اگائی جانے والی سبزیوں سے ۳۰ فیصد زیادہ تیزی سے نشوونما پاتی ہیں۔(بحوالہ منصف،حیدرآباد، ۲/اکتوبر ۲۰۱۶ء)

''عبدالعزیز رنتیسی اور بیلا ڈیوائٹکنا کی ذہانت''

مغربی غزہ کے جامع النور مدرسہ کے ایک طالب علم جس کا نام عبدالعزیز رنتیسی ہے نے صرف ایک ماہ میں قرآن حفظ کرکے عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے۔صحافی یوسف البردویل سے اس کے والد نے کہا کہ یہ بچہ فلسطینی رہنما عبدالعزیز رنتیسی کی دعاؤں کا ثمرہ ہے،اسی لیے ہم نے ان ہی کے نام پر اس کا نام رکھا۔ان کے بیان کے مطابق جب ہم نے اس بچہ کو مدرسہ میں داخل کیا تو اس کی غیر معمولی ذہانت نے اساتذہ کو حیران کردیا۔اس نے ہر روز ایک پارہ حفظ کرکے اپنے استاد کو سنایا اور ایک ماہ کے مختصر ترین عرصہ میں حفظ مکمل کرلیا۔اس کے استاد ابوبکر کا کہنا ہے کہ ان کے پاس کم سے کم وقت میں حفظ قرآن کا ریکارڈ آٹھ ماہ کا ہے۔لیکن ایک ماہ میں حفظ قرآن کے عالمی ریکارڈ کو توڑ پانا شاید مشکل ہے۔صحافی نے اس سلسلہ میں جب عبدالعزیز سے پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ سب اللہ رب العزت کی عطا اور حماس قائد عبدالعزیز رنتیسی کی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔مزید کہا کہ میں اپنے والدین کی دو خواہشات کی تکمیل کے لیے جان لڑانے کے لیے تیار ہوں۔پہلی خواہش پوری ہوچکی ہے،دوسری خواہش فلسطینی قوم کی رہنمائی کی ہے اور آنے والے ایام میں فلسطینی قوم کے مسائل کے حل اور بیت المقدس کی آزادی کے لیے جدوجہد کروں گا۔اسی کے ساتھ یہ خبر بھی دلچسپ ہے۔بیلا ڈیوائٹکنا نامی روس کی چار سالہ بچی ہے،جس نے روسی ٹی وی چینل کے ایک رئیلٹی شو بنام ''غیر معمولی لوگ'' کے دوران بہت مہارت سے کئی زبانیں بول کر ناظرین کو حیرت میں ڈال دیا۔خبر کے مطابق بچی کی مادری زبان روسی ہے لیکن وہ انگریزی،عربی،چینی،ہسپانوی،فرانسیسی اور جرمن زبان نہ صرف بولتی بلکہ سمجھتی بھی ہے۔شو کے دوران اس نے درسی کتابوں سے کیے گئے سوالات کے جواب اسی زبان میں دیے۔انگریزی زبان ماں اور بقیہ زبانوں کے لیے اساتذہ سے استفادہ کیا ہے۔(اول الذکر خبر منصف،حیدرآباد، ۲۷/اکتوبر اور دوسری خبر انقلاب سے لی گئی ہے)

ک،ص اصلاحی

آثار علمیہ و تاریخیہ

مولانا عبدالماجد دریابادی کے خطوط
ڈاکٹر سید سلمان ندوی کے نام

دریاباد، ضلع بارہ بنکی
۱۴؍مئی ۱۹۶۳ء

مخدومہ مکرمہ۔ وعلیکم السلام

نوید مسرت ۱۱؍مئی کی شام کے لیے عین ۱۱ ہی کی شام کو موصول ہوئی (۱)۔ اگر پہلے بھی پہنچتی، جب بھی نتیجہ یہی رہتا یعنی حاضری سے محرومی۔ لیکن دل بہت ہی پھڑ پھڑایا اور جی میں بے اختیار یہی آیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اُڑ کر پہنچ جاؤں۔

سید صاحب یوں بھی یاد آیا ہی کرتے ہیں (ہر صبح قبل نماز فجر جن ۱۰، ۱۲ محسنوں اور محبوبوں کا نام لے کر ان کے حق میں مختصر دعائے خیر کی توفیق ہوجاتی ہے، اس خصوصی فہرست میں ایک نام نامی سید صاحب کا بھی ہے)۔ دعوت نامہ کو پڑھ کر کیا بتاؤں کتنا زیادہ یاد آئے۔

بہرحال اللہ یہ تقریب آپ کو، صاحب تقریب کو اور سارے ہی اعزہ و متعلقین کو ہر طرح مبارک کرے، اخلاص قلب کے ساتھ اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

میری بڑی لڑکی تو آپ سے مل کر آپ کی بڑی معتقد ہوگئی ہے۔ (۲) والسلام دعا گو و دعاخواہ

(مولانا) عبدالماجد

---

(۱) یہ خط میری والدہ مرحومہ کے نام میری شادی کے موقع پر دعوت نامہ کے جواب میں۔ میری شادی ۱۱؍مئی ۱۹۶۳ء کو ہوئی تھی۔ (۲) ممکن ہے کہ میری والدہ سے مولانا کی بڑی صاحبزادی کی ملاقات ہندوستان لکھنؤ میں آمد کے موقع پر میرے بہنوئی سید حسین صاحب مرحوم کمشنر کے مکان پر ہوئی ہو۔

(۲)

دریاباد
۲۳؍جنوری ۱۹۶۴ء

عزیزم سلمہ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

بڑے انتظار کے بعد خیریت نامہ الحمدللہ کہ اب ملا۔ اپنی روانگی کی تو خبر بھی نہیں کی تھی۔ دوسروں

سے حال معلوم ہوا۔ نئی اور محبوب بیوی کو چھوڑ کر اتنے عرصہ کے لیے پردیس چلا جانا ہے بڑا مجاہدہ۔ میں تو نہ کر پاتا۔ خیر اللہ ہر طرح ہمت قوی رکھے اور یہ طویل مدت خوشی خوشی کاٹ دے۔ پردیس بھی کیسا دیس؟ آزمائشوں اور کڑی آزمائشوں کا جال قدم قدم پر بچھا ہوا۔(۱)

خیر اللہ دین وملت کا سچا اور پختہ خادم بنا کر واپس لائے اور سیرۃ نگار نبوی کی روح کو برزخ میں خوش وخرم رکھے۔ خط کا بڑا حصہ صدق کی نذر ہوگا۔ گنجائش نکلتے ہی۔

مکتوبات سلیمانی سمندری ڈاک سے بھجوادی تھی۔ انشاء اللہ پہنچ رہی ہوگی۔ ایک تکلیف دہ اور ناقابل یقین حد تک عبرت انگیز المیہ سنیے۔ کتاب کی شدید ترین مخالفت شروع ہوگئی۔ یہ کہاں سے؟ دفتر چٹان یا اور معلوم ومعروف حلقوں سے؟ جی نہیں۔ خاص الخاص حلقۂ سلیمانی یعنی دارالمصنّفین سے! ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں(۲) یہاں کے انگریزی روزناموں میں عجائب زار کالم Believe it or not کے عنوان سے ہوتا ہے۔(۳) اس میں درج ہونے کے قابل!(۴) مولوی مسعود صاحب کا خفگی نامہ اشاعت سے چند دن قبل آگیا تھا اور اشاعت کے بعد یہ حکم پہنچا کہ ایجنسی کے لیے کوئی کتاب نہ بھیجی جائے!

شاہ صاحب کا خط اشاعت کے بعد یہ آیا کہ کتاب پر نظر ڈالی، بہت غنیمت نکلی اور وہ بات نہ ملی جس سے میں ڈر رہا تھا۔ ریویو معارف میں فوراً نہ کروں گا بلکہ دوسروں کا رنگ دیکھ کر اپنے ریویو میں ان کا جواب دوں گا۔(۵) دوسرے خط بھی اسی مضمون کے شاہ صاحب کے آتے رہے۔ اتنے میں مدینہ آیا۔ اس میں شاہ صاحب کا خط ان کے عزیز کے نام کا چھپا ہوا دیکھا۔ اللہ اللہ! عالم ہی دوسرا۔ کتاب سے دارالمصنّفین کی قطعی بے تعلقی کا اظہار۔(۶) اور سید صباح الدین بھی شاہ صاحب کے اس نقش قدم پر! اور یہی روایت سید نجیب اشرف کے لیے بھی سننے میں آئی ہے۔(۷) مولوی مجیب اللہ ندوی اور ابوعلی، عبدالباری ان دو کے خط اس سے قبل کتاب کی تائید میں آچکے تھے!(۸) بہر حال اب صدارت اور رکنیت دونوں سے استعفا لکھ کر بھیج دیا ہے۔(۹)

عام پذیرائی کتاب کی الحمدللہ بہت اچھی ہو رہی ہے۔ الجمعیۃ، جامعہ، بینات، ذوالقرنین، کتابی دنیا وغیرہ۔ ۸، ۱۰ پرچوں کے ریویو آچکے ہیں خطوط میں مخالف کوئی ایک بھی نہیں۔ شمیمہ سلمہا(۱۰) کی گرویدگی کا حال لکھنؤ میں سید حسین کی زبانی پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔(۱۱) خیر نفس بشری کے متعلق یہ تجربہ بھی خوب رہا۔ آیندہ بھی ایسے خطوط کا منتظر رہا کروں گا۔

والدعا

(مولانا) عبدالماجد

---

(۱) میں ستمبر ۱۹۶۳ء میں پی ایچ ڈی کی تعلیم کے لیے امریکہ شکاگو یونیورسٹی چلا گیا تھا۔ ۱۱ر مئی ۱۹۶۳ء میں میری شادی ہوئی

تھی۔اہلیہ کو پاکستان میں چھوڑ دیا تھا کہ امریکہ پہنچ کر جب رہنے کا مستقل بندوبست ہوگا تو بلا لوں گا،اس فراق پر ہمدردی کا ذکر ہے۔(۲) مولانا کی مکتوبات سلیمانی کی پہلی جلد کی اشاعت پر شکایت کی ہے کہ چونکہ اس میں مولانا نے کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ذاتی خط جو والد ماجد کے نام تھا شائع کر دیا تھا۔اس خط کے شائع ہونے پر دارالمصنّفین والے بھی ناراض تھے اور رفقا یا حامیان آزاد بھی خفا تھے۔(۳) یعنی اہل دارالمصنّفین کی ناراضگی ناقابل یقین ہے۔(۴) اشارہ ہے مولانا مسعود علی ندوی منیجر دارالمصنّفین کی طرف حالانکہ مولانا مسعود علی صاحب کا تعلق مولانا دریابادی سے دوستی ہی کا تھا۔(۵) اشارہ ہے شاہ معین الدین ندوی صاحب کی طرف جو اس وقت ناظم دارالمصنّفین تھے۔(۶) شاہ صاحب کا مضمون شکایتی کسی اور نام سے مدینہ اخبار میں شائع ہوا۔(۷) سید صباح الدین صاحب رفیق دارالمصنّفین مصنف بزم صوفیہ اور سید نجیب اشرف مصنف رقعات عالمگیر مراد ہیں۔(۸) مولانا مجیب اللہ ندوی جو بھی رفیق دارالمصنّفین تھے اور جنہوں نے بعد میں جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ قائم کیا۔اور ابوعلی عبدالباری جو دارالمصنّفین میں لائبریرین تھے۔(۹) دارالمصنّفین کی مجلس منتظمہ کی صدارت ورکنیت سے استعفا۔(۱۰) کتاب کی پذیرائی اور قبولیت۔(۱۱) میری بڑی ہمشیرہ شکیلہ جن کے شوہر سید حسین صاحب جو ایک زمانہ میں لکھنؤ میں کلکٹر تھے۔شمیمہ کا نام غلطی سے لکھ دیا، کیونکہ میری سب سے بڑی بہن شمیمہ کراچی پاکستان میں تھیں۔

(۳)

دریاباد

۱۵/جولائی ۱۹۶۴ء

عزیزی سلمہ۔ السلام علیکم

مدت دراز کے بعد آج لکھنے کی نوبت آرہی ہے۔کوئی خاص ضرورت بھی درمیان میں نہ ہوئی(۱)۔انشاءاللہ ہر طرح خیریت سے ہوں گے(۲)۔بڑی خوشی ہوئی یہ سن کر کہ آں عزیز کی اہلیہ بھی وہاں پہنچ گئیں۔اس سن والے کے لیے ایک طویل عرصہ تک مجرد رہنا خصوصاً اس ماحول میں ایک بڑا صبر آزما مجاہدہ تھا۔الحمد للہ کہ یہ منزل کٹ گئی۔اور ہاں پردہ وحجاب کا انتظام تو وہاں کسی درجہ میں بھی کیوں بن پڑتا ہوگا؟(۳)۔

مکتوبات کی مانگ خدا کے فضل سے توقع سے بڑھ کر رہی(۴)۔تبصرے ۲۰ کی اور تعداد میں نکلے، اپنی عادت ومعمول کے خلاف میں نے سب پڑھے (اپنی کتابوں پر تبصرے میں پڑھا نہیں کرتا) ان میں سے ۱۷ تمام تر مادحانہ تھے۔ایک ۵۰ فیصد مادحانہ اور صرف دو مخالفانہ بلکہ معاندانہ۔بدزبانی سے لبریز،ایک لاہور کے ہفت روزہ جس کی نظر میں میں مستقل طور پر مبغوض ہوں(۵)۔دوسرا بمبئی کے ایک گمنام ماہنامہ میں

(جس کے بارے میں بدگمانی یہ ہے کہ مولوی نجیب اشرف کے اشارہ سے(۶)۔

حصہ دوم کا مسودہ صاف شدہ پریس میں جانے کو تیار ہے۔ جب بھی میری جیب اس کی اجازت دے۔ کاغذ، چھپائی وغیرہ کی شرحیں جو آج کل، ہیں ظاہر ہے۔(۷)

حکیم الامت کے نئے ایڈیشن کے لیے مولوی رئیس احمد جعفری خود ہی سے تیار ہو گئے ہیں۔ مسودہ اس ہفتہ انہیں روانہ کر دیا ہے(۸)۔ مولانا محمد اویس نگرامی بحمدللہ سید صاحب کے افادات قرآنی شائع کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ صدق میں انشاءاللہ نکلیں گے۔ اب کام کیا ہو رہا ہے، کہاں تک پہنچا ہے واپسی کی توقع کب تک ہے(۹)۔

سخی احمد صاحب سندیلوی کئی ہفتہ سے آئے ہوئے ہیں۔ دارالمصنّفین کی صدارت ورکنیت سے واپس لے لیا۔

(آخری سطریں پوری نہیں پڑھی جا سکی)

والسلام دعا گو

(مولانا) عبدالماجد

---

(۱) مولانا کا خط دریافت خیریت۔ (۲) میں نے اپنی اہلیہ جن کو شادی کے بعد پاکستان میں ہی چھوڑ دیا تھا، ان کو پھر شکاگو بلوا لیا تھا۔ اسی طرف اشارہ ہے۔ (۳) امریکہ میں بے حجابی کے رجحان کے ڈر کی طرف اشارہ تھا۔ الحمدللہ اہلیہ حجاب کے ساتھ ہی رہیں۔ (۴) مکتوبات سلیمانی کی قبولیت کی طرف اشارہ ہے۔ (۵) اشارہ ہے میرے رشتہ کے چچا نجیب اشرف صاحب کی طرف جو بمبئی میں اردو کے پروفیسر تھے۔ (۶) اشارہ ہے مکتوبات سلیمانی جلد دوم کی طرف۔ (۷) اشارہ ہے مولانا کی کتاب مولانا تھانوی سے متعلق نقوش وتاثرات کی طرف۔ (۸) مولانا محمد اویس نگرامی شیخ التفسیر ندوۃ العلماء کی طرف اشارہ ہے۔ مولانا اویس صاحب ایک زمانہ میں دارالمصنّفین میں رفیق کی حیثیت سے کام کر چکے تھے اور دارالمصنّفین میں والد ماجدؒ کی تفسیر قرآن کی مجلس سے استفادہ کرتے تھے۔ (۹) سخی احمد صاحب پاکستان میں سندھ یونیورسٹی میں غالباً اردو شعبہ میں تھے، وہ ہندوستان کچھ روز کے لیے آئے ہوئے ہوں گے۔ (۱۰) دارالمصنّفین کی صدارت ورکنیت سے جو استعفا دیا تھا اس کو احباب اور رفقائے دارالمصنّفین کے اصرار پر واپس لے لیا تھا۔

(باقی)

تلخیص و ترجمہ

الناسخ والمنسوخ

''شیخ مناع القطان کی کتاب

''مباحث فی علوم القرآن'' کے ایک باب کی مختصر تلخیص''

فضل الرحمٰن اصلاحی

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''الفوز الکبیر'' میں لکھا ہے کہ ''علوم تفسیر کے مشکل مقامات میں ناسخ ومنسوخ کی بحث بھی ہے جس پر علماء نے کافی داد تحقیق دی ہے اور ابھی اس سلسلے میں مزید بحث کی گنجائش موجود ہے۔ علاوہ ازیں اس کے معنی و مفہوم کا تعین کرنے میں بھی اختلاف رائے ہے۔ بہرحال حضرت شاہ صاحب کے نزدیک پورے قرآن میں ۱۹ آیات منسوخ کی قبیل میں داخل ہیں۔ (الفوز الکبیر، تعریب مفتی سعید صاحب پالن پوری، ص ۷۱-۷۵)

اس سلسلے میں مولانا فراہی کی رائے یہ ہے کہ:

''بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی کے بارے میں معروف کا حکم ہوا۔ پھر اس کے متعلق توضیح نازل ہوئی تو جس حصہ سے متعلق توضیح نازل ہوئی اس میں تو معروف منسوخ ہو گیا اور جس پارہ میں توضیح نازل نہیں ہوئی اس میں معروف کا حکم بدستور باقی رہا۔ مثلاً مرنے والے کی وصیت والدین کے لیے منسوخ ہو گئی اور جن اقربا کو وراثت میں کوئی حق نہیں ملا ہے ان کے لیے باقی رہ گئی''۔ (تفسیر قرآن کے اصول، ص ۸۳، مولانا حمید الدین فراہی، ترتیب و ترجمہ ڈاکٹر خالد مسعود مرحوم)

شیخ مناع القطان نے اس بحث کو بڑے مدلل اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''شریعت کا نزول اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے رسولوں پر ہوا ہے تاکہ وہ عقیدے، عبادات اور معاملات میں لوگوں کی اصلاح کر سکیں۔ عقیدہ کا معاملہ تو بالکل عیاں ہے، اس میں کوئی

اسکالر دار المصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

شک وشبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وحدہ لاشریک ہے، اس کی توحید وربوبیت میں کوئی دوسرا شریک و سہیم نہیں ہے اور یہی تمام انبیاء کرام کی متفقہ دعوت رہی ہے۔ وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون۔ (الانبیاء:۲۵)

عبادات ومعاملات کی تشریح کرنے کے بعد اصل موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''نسخ کے لغوی معنی زائل کرنے کے ہیں مثلاً نسخت الشمس الظل (یعنی دھوپ نے سائے کو زائل کردیا) اور یہ کسی چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں نسخت الکتاب (یعنی میں نے کتاب کو نقل کیا)۔ ایک کتاب سے اس کے محتویات کو نقل کرنے کے بعد یہ لکھا جاتا ہے۔ ایسے ہی قرآن مجید میں ہے''انا کنا نستنسخ ما کنتم تعلمون''اور یہاں مطلب اعمال کا صحیفوں میں منتقل کرنا ہے۔

اور نسخ کے اصطلاحی معنی حکم شرعی کا خطاب شرعی سے رفع ہونا ہے اور ناسخ جب اللہ تعالیٰ کے لیے بولا جاتا ہے تو اس کا مطلب قرآن کی اس آیت سے بالکل واضح ہے''ما ننسخ من آیۃ''۔ (الجاثیہ:۲۹)

چنانچہ قرآن مجید کی آیات کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آیت پہلی آیت کے لیے ناسخ ہے۔ منسوخ اس حکم کو کہتے ہیں جواب باقی نہیں رہا۔ مثال کے لیے آیت میراث کو پیش کیا جاسکتا ہے جس نے''یوصیکم اللہ فی اولادکم''(سورۃ النساء:۱۱) منسوخ کردیا ہے۔

نسخ کہاں واقع ہوتا ہے: یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ نسخ امر ونواہی ہی میں واقع ہوتا ہے چاہے وہ صریح طور پر ہو یا خبریہ انداز میں۔ نسخ کبھی عقائد میں نہیں ہوتا، تمام شرائع کا اس پر اتفاق ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحًا والذی أو حینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم و موسی و عیسی ان اقیموا الدین و لا تتفرقوا فیہ۔ (الشوریٰ:۱۳)	اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔ (ترجمہ: مولانا تھانویؒ)

نسخ کی پہچان اور اس کی اہمیت: اہل علم کے نزدیک ناسخ اور منسوخ کی پہچان بڑی اہمیت کی حامل

ہے تاکہ احکام باہم گڈمڈ نہ ہوسکیں، اسی لیے اس سلسلے میں آثار صحابہ کثرت کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔

مثلاً ایک مرتبہ حضرت علیؓ کا گزر ایک قاضی کے پاس ہوا تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا، کیا تمہیں ناسخ و منسوخ کی پہچان ہے، تو اس قاضی نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر حضرت علیؓ نے (خفگی کے انداز میں) فرمایا، پھر تو ہلاک ہوجائے گا یا لوگوں کو ہلاک کردے گا۔ اس پر حضرت ابن عباسؓ نے ''ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا'' (البقرہ:۲۶۹) سے استدلال فرمایا ہے کہ اہل علم کو ناسخ، منسوخ، محکم و متشابہ، مقدم، موخر اور حرام و حلال کی پہچان ہونی چاہیے۔

اب ناسخ و منسوخ کی پہچان کے چند طریقے درج ذیل ہیں:

۱۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی صحابی سے کسی صحیح بات کا ثبوت۔ مثلاً ایک مشہور حدیث ہے:

کنت نہیتکم عن زیارۃ القبور الا فزوروھا۔ (رواہ الحاکم)	میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے روک دیا تھا، اب ان کی زیارت کیا کرو۔

اور یہ اثر جو قصۂ اصحاب بئر معونہ کے بارے میں حضرت انس بن مالک کی طرف منسوب ہے۔

ونزل فیھم قرآن قرآناہ حتی رفع	اور ان کے درمیان قرآن نازل ہوا اور اس قبیلہ کا جو قرآن تھا منسوخ ہوگیا۔

۲۔ کسی امر پر اس کے ناسخ و منسوخ ہونے پر اجماع امت ہو۔

۳۔ تاریخی واقعات میں مقدم اور موخر کی تمیز ہو۔

۴۔ اجتہاد میں نسخ کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، ایسے ہی اقوال مفسرین میں بھی، ایسے باہم دلائل کے درمیان ظاہری طور پر اختلاف ہوجانے کی بنا پر یا ایسے ہی دو راویوں کے درمیان ان کے قدیم اسلام کی تعیین یعنی ان میں کون زیادہ قدیم اسلام ہے۔ ان سب صورتوں میں بھی نسخ کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

نسخ کے بارے میں چند آراء اور دلائل: اس سلسلے میں اہل علم کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ یہود نسخ کے منکر ہیں، ان کے خیال کے مطابق نسخ اگر خلاف حکمت واقع ہوگا تو یہ اللہ پر ایک عبث لازم آئے گا اور اگر یہ کسی ایسی حکمت کے پیش نظر ہو جو اس سے قبل ظاہر نہیں ہوئی تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ممکن ہے۔

یہود کا مذکورہ استدلال بالکل باطل ہے، کیونکہ ہر ناسخ اور منسوخ کی حکمت اللہ کے علم میں پہلے

سے موجود ہوتی ہے اور یہ اس کے علم میں کسی نئی معلومات کا ذریعہ نہیں بنتے، بلکہ اللہ تعالیٰ بسا اوقات بندوں کی خاطر مصلحتاً بعض حکم کو بعض حکم سے تبدیل کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہود بذات خود اس بات کے معترف ہیں کہ شریعت موسوی اپنے ماقبل کی شریعت کے لیے ناسخ ہے اور تورات کی ایک نص سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے، مثلاً بہت سے جانور حلال ہونے کے باوجود بنی اسرائیل پر حرام تھے۔ اللہ کا ارشاد ہے ''کل الطعام کان حلا لبنی اسرائیل الا ما حرم اسرائیل علی نفسہٖ''۔ (آل عمران: ۹۳)

ایک دوسری آیت اس پر شاہد ہے:

وعلی الذین ھادوا حرمنا کل ذی ظفر۔ (الانعام: ۶:۱۴۶) اور یہود پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیے تھے۔

نیز تورات میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت آدمؑ نے اپنی بہن سے شادی کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے یہ چیز حضرت موسیٰؑ پر حرام فرمائی تھی۔

روافض نسخ کے بارے میں غلو کا شکار ہو گئے، اس بارے میں ان کے یہاں کافی وسعت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے استدلال میں حضرت علیؓ کی طرف منسوب بعض جھوٹے اقوال کا سہارا لیا ہے۔

اسی طرح انہوں نے اپنے استدلال میں یہ آیت بھی پیش کی ''یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت'' (الرعد: ۳۹) خدا تعالیٰ ہی جس حکم کو چاہیں موقوف کر دیتے ہیں اور جس حکم کو چاہیں قائم رکھتے ہیں۔

حالانکہ آیت کا منشا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ جس چیز کو چاہے قرار پائے۔ ہر چیز میں محو و اثبات پایا جاتا ہے۔ مثلاً ''محو السیئات بالحسنات'' یعنی نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔

چنانچہ قرآن مجید کی یہ آیت اسی پس منظر میں ہے کہ ''ان الحسنات یذھبن السیئات'' (ہود: ۱۱۴) بے شک نیک کام برے کاموں کو مٹا دیتے ہیں۔

اسی طرح معاصی کا ارتکاب کرنے والوں کے گناہ توبہ کے ذریعہ بخش دیے جاتے ہیں، اس کے ذریعہ ان کے ایمان و طاعات میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔

ابومسلم اصفہانی (جو عقیدۃً معتزلی تھے) کا موقف یہ ہے کہ نسخ عقلاً تو جائز ہے لیکن شرعاً ممنوع ہے، کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ و لا من قرآن بڑی ہی باوقعت کتاب ہے جس میں غیر واقعی

خلفه، تنزیل من حکیم حمید۔ (فصلت:۴۲)　　بات نہ اس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے۔

مطلب وہ یہ نکالتے ہیں کہ قرآن کے احکام کبھی باطل نہیں ہوتے اور آیات نسخ کو وہ تخصیص پر محمول کرتے ہیں۔

اس موقف کی تردید کے لیے عرض ہے کہ یہاں پر آیت کا مطلب ومنشا یہ ہے کہ گزشتہ آسمانی کتابوں کے جو کچھ احکام باطل ہو چکے ہیں اسے قرآن پیش نہیں کرتا اور نہ اس کے بعد باطل کی کوئی گنجائش ہے اور اس سلسلے میں جمہور کا موقف یہ ہے کہ وہ نسخ کے عقلاً وشرعاً وقوع کے قائل ہیں اور ان کے چند دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔اللہ تعالیٰ کے افعال اغراض کے پیش نظر نہیں ہوتے بلکہ بندوں کی مصلحتوں کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ایک چیز کا حکم فرمایا ہے اور کبھی اسی کو کہیں دوسری جگہ منع کر دیا۔

۲۔کتاب وسنت سے نسخ ثابت ہے۔مثلاً قرآن میں ہے:

و اذا بدلنا آیة مکان آیة و اللہ اعلم بما ینزل قالوا انما انت مفتر۔ (سورۃ النحل:۱۰۱)　　اور جب ہم کسی آیت کو بجائے دوسری آیت کے بدلتے ہیں اور حالانکہ اللہ تعالیٰ جو حکم بھیجتا اس کو وہی خوب جانتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ افتراء کرنے والے ہیں۔

دوسری جگہ قرآن ہی میں مذکور ہے:

ما ننسخ من آیة او ننسها نأت بخیر منها او مثلها (البقرہ:۱۰۶)　　ہم کسی آیت کا حکم جو موقوف کر دیتے ہیں یا اس آیت ہی کو ذہنوں سے فراموش کر دیتے ہیں تو ہم اس آیت سے بہتر یا اس آیت ہی کے مثل لے آتے ہیں۔

ایک صحیح حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

قال عمر رضی اللہ عنه: امرؤنا ابی، و اقضانا، و انا لندع من قول ابی۔ اسی بنا پر حضرت ابی بن کعب فرماتے تھے جو کچھ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اسے کبھی چھوڑ نہیں سکتا، اور یہ آیت پڑھتے تھے ما ننسخ من آیة او ننسها۔

معارف کی ڈاک

تہذیب قوم نوحؑ وادریسؑ

سیوری، منجھول،
بیگوسرائے (بہار)
۲۹/۵/۲۰۱۶ء

مکرمی! سلام مسنون

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

معارف اپریل ۲۰۱۶ء میں آپ نے جناب محمد طارق غازی صاحب کے دوقیمتی مقالات ''تہذیب قوم نوحؑ'' اور تہذیب قوم ادریسؑ'' کے جائزے پر مبنی میرا عامیانہ سطروں کا حامل خط شائع کیا۔اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

متذکرہ خط میں مسئلے کو مالہ وماعلیہ کے ساتھ پیش کش کی بات کہی گئی تھی۔یہ تحریر اسی ایفائے عہد کے متعلق ہے۔اب اس قرآنی بحث کو دوبارہ ''ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا'' کہہ کر شروع کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے متعلقہ آیت ''**واذا اردنا ان نهلک قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليه القول فدمرناها تدميرا**'' کا غازی موصوف کے ذریعے پیش کردہ ترجمہ ''معارف'' کے ذی وقار قارئین کے سامنے لایا جاتا ہے۔

> ''اور جب ہم کسی شہر (تہذیب) کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے مال داروں کو حکم بھیج دیتے ہیں۔وہ حق سے سرتابی کرتے ہیں اور فسق میں مبتلا ہوجاتے ہیں، تو انہیں اکھاڑ پھینکا جاتا ہے''۔(معارف، دسمبر ۲۰۱۵ء، ص ۴۰۶)

''اس کے مال داروں کو حکم بھیج دیتے ہیں'' کے ترجمے سے انسانی ذہن مشیت ایزدی، منشاے الٰہی اور غایت ربانی کی تفہیم سے عاجز وقاصر رہتا ہے جو کہ قرآن کے آفاقی پیغام اور ابدی

تعلیم ''تدبر و تفکر'' کے منافی ہے، جس سے لامحالہ اس کے دوسرے معنی و مفہوم کی گنجائش نکل آتی ہے جو أقرب الی الوقوع، اوقع فی النفس، دل آویز، دل کش اور دل نشیں ہو۔

مولانا عبدالسلام ندویؒ ''اسوۂ صحابہ دوم'' میں ''علم التفسیر'' کے عنوان کے تحت ص ۲۲۶ پر رقم طراز ہیں:

''۷۔ قرآن مجید کی صحیح تفسیر کا دار و مدار تمام تر عربیت پر ہے۔ لیکن مفسرین نے عربیت کے اصول و قواعد کو چھوڑ کر متعدد غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے: ''و اذا اردنا ان نهلك قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها (جب ہم کسی گاؤں کو برباد کرنا چاہتے ہیں، تو اس کے دولت مندوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ لوگ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں)۔

لیکن اگر اس آیت میں امر کے معنی حکم کے لیے جائیں، جیسا کہ عام مفسرین نے لیے ہیں، تو اس سے لازم آتا ہے کہ خدا ہی ان کو فسق و فجور کا حکم دیتا ہے، حالانکہ خدا برائیوں کا حکم نہیں دیتا، مفسرین کے دل میں یہ اعتراض کھٹکا ہے اور انہوں نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں۔ لیکن خصائص ابن جنی میں متعدد شواہد سے ثابت کیا ہے کہ امر کے معنی کلام عرب میں کثرت کے بھی آتے ہیں، اس آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ جب ہم کسی شہر کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو بہت سے امراء پیدا کر دیتے ہیں اور امارت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مبتلائے فسق و فجور ہو جاتے ہیں، جو تباہی کا پیش خیمہ ہے اور اس تفسیر پر کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔

صحابۂ کرام سے بڑھ کر عربیت کا کون ماہر ہو سکتا تھا؟

اس لیے انہوں نے اس قسم کے موقعوں پر ٹھیک وہی تفسیر کی ہے جو ادب و عربیت کا اقتضا تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس آیت کی جو تفسیر منقول ہے۔ اس میں انہوں نے امر کے معنی کثرت ہی کے لیے ہیں۔ ان کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

كنا نقول للحي اذ اكثروا في الجاهلية امر بنو فلان۔ (۱)	زمانہ جاہلیت میں جب کوئی قبیلہ بڑھ جاتا تھا تو ہم کہتے تھے کہ امر بنو فلان۔

---

(۱) کتاب البخاری، باب اذا اردنا ان نهلك قرية الخ۔ (اسوۂ صحابہ، حصہ دوم، از مولانا عبدالسلام ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، چوتھا ایڈیشن، ۲۰۰۴ء، ص ۲۲۶)

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس علمی مسئلے کے حل کے لیے شاعر معارف جناب وارث ریاضی کا نام نہ لیا جائے، موصوف نے اپنے یہاں قیام وطعام کی سہولت فراہم کرکے نیز متذکرہ بالا کتاب عنایت کرکے میری مدد اور رہنمائی کی۔ اللہ انہیں صحیح سلامت رکھے تاکہ وہ ریاض فکروفن کی آب یاری کرتے رہیں اور دارالمصنّفین کے گنجینۂ علوم ومعارف کے مصداق اس رسالے کو اپنے ادبی نگینوں سے سجاتے رہیں۔ آمین۔

فقط، نیاز کیش

(جناب) راجو خان

فارسی تراجم و ہندوستانی مذاہب

ایف ۲۳۶، لوئر ہری سنگھ نگر،
رہاڑی کالونی، جموں
۵/۱۱/۲۰۱۶ء

محب مکرم مدیر صاحب! آداب

ماہنامہ ''معارف'' ماہ اگست سے مسلسل موصول ہو رہا ہے۔ اپنی سو سالہ زندگی سے آگے بڑھنے کے باوجود اس کی صحت وسادگی میں شاید کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے مشمولات ومندرجات مواد کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں۔ اسلامی عقائد کی تشہیر اس کا بنیادی مقصد ہے، مگر بعض علمی مضامین آنکھوں کی روشنی بڑھا دیتے ہیں، مثلاً ستمبر کے شمارے میں شامل مضمون ''ہندوستانی کتابوں کے فارسی تراجم ہندوستانی مذاہب اور تمدن کی افہام وتفہیم'' از جناب شریف حسین قاسمی۔

مضمون نگار نے جس تلاش وتحقیق کے بعد یہ مضمون قلم بند کیا، یہ انہی کے حصے کی چیز ہے۔ مضمون نگار نے شمارے کے صفحہ ۱۲۰ پر ویدوں کا ذکر کیا ہے اور وید مقدس کے فارسی ترجمے کے قلمی نسخے کا دستیاب نہ ہونا لکھا ہے، تو پھر ڈاکٹر تارا چند کے مقدمے کے ساتھ رگ وید کا فارسی انتخاب کہاں سے حاصل کیا گیا اور اسے ایران سے کیسے شائع کیا گیا ہے؟ کیا رگ وید کا اردو ترجمہ کہیں سے دستیاب ہوسکتا ہے (ہندی میں چاروں ویدوں کے ترجمے میرے پاس موجود ہیں، ساتھ ہی گیتا جی کے پندرہ اردو ترجمے بھی، جن میں چار مسلم حضرات کے ہیں)۔

میری ناقص معلومات کے مطابق اکبر کے دور حکومت میں (۱) مہابھارت ۶۔ (۲) رامائن

کے ۲۴۔(۳) بھگوت پران کے گیارہ۔(۴) بھگوت گیتا کے ۸۔(۵) یوگ وششٹ کا ایک اور دارا شکوہ کے عہد میں ۵۲ اپنشدوں، یوگ وششٹ، سمندر سنگم اور گیتا کے ایک ایک ترجمے ہوئے (فارسی میں)۔

ہندوایران کے تعلقات قدیم زمانے سے ہیں۔قدیم ایران کو ایریانہ یا آریانہ کہا جاتا تھا۔ یہ سنسکرت لفظ ہے۔ایران سے ملحق گاندھار کے علاقے کا تعلق ہندوستان سے ۵۵۰۰ برس قبل مسیح سے ہے۔مہابھارت کے عہد کے راجا دھرت راشٹر کی پتنی گاندھاری، گاندھار کے راجا کی بیٹی تھی۔ مہابھارت کی جنگ ۱۶/اکتوبر ۵۵۶۱ قبل مسیح کے دن شروع ہوئی تھی جو اٹھارہ دن تک چلی (اس کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون ''مہابھارت اور بھگوت گیتا'' مشمولہ ماہنامہ ''آج کل'' نئی دہلی، شمارہ اکتوبر ۲۰۱۶ء، ص ۴۲-۴۵)۔

راقم کی درخواست ہے کہ اگر جناب شریف حسین قاسمی اسی قسم کا ایک مضمون ہندوستان کی مقدس کتب سے متعلق (جس میں دونوں مذہب شامل ہوں) اردو تراجم کا قلم بند کریں تو یہ ہماری مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی عمدہ مثال ہوگی۔راقم کی نظروں سے مہابھارت، رامائن، گیتا جی، گوروگرنتھ صاحب، جپ جی صاحب، بائبل اور قرآن مقدس کے اردو ترجمے (اور تفسیریں) گزری ہیں، مگر اس قسم کا کوئی مکمل و معلوماتی مضمون اردو تراجم سے متعلق نہیں گزرا۔

راقم کے پاس قرآن مجید کا عربی اردو نسخہ، اردو ترجمہ، تفسیر (مدینہ منورہ کی اشاعت) اور انگریزی نسخہ موجود ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پہ مبنی ''الرحیق المختوم'' اور بہت سی دوسری مذہبی کتب موجود ہیں۔ان کتب کے مطالعہ سے ذہن روشن ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو قریب سے قریب تر جانے کا موقع میسر آتا ہے۔

میری ایک گزارش اور ہے کہ ہر مضمون نگار کا مکمل پتا اور ٹیلی فون نمبر ہر مضمون کے آخر میں ضرور درج کیا جائے تا کہ قاری سیدھے طور پر اپنی معلومات میں اضافہ کر سکے یا اپنے خدشات کا ازالہ۔

میں ہر شمارے کا مکمل مطالعہ کرتا ہوں، دوران مطالعہ بہت سے سوالات سامنے آتے ہیں، کوئی کس سے دریافت کرے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ میری درخواست کو ضرور شرف قبولیت حاصل ہوگا اور آئندہ کے شماروں میں پتے اور نمبر درج کیے جائیں گے۔ نیازمند

(ڈاکٹر) ٹی آر رینا

وفیات

آہ! ڈاکٹر خلیق انجم مرحوم (۱۹۳۵ء-۲۰۱۶ء)

۱۸/اکتوبر ۲۰۱۶ء کو جناب خلیق انجم نے اس دنیائے فانی کو خیر باد کہہ دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۵ء میں وہ دہلی میں پیدا ہوئے اور دہلی کی تمام روایتوں کو سینے سے لگائے وہ اسی دہلی کی خاک سے جا ملے۔ اسّی سے کچھ اوپر ان کی عمر کا حساب کیا جائے تو اس کی معنویت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ ادیب، محقق، معلم، مدیر اور منتظم ہر حیثیت سے ان کو یہ کہنے کا حق بجا طور پر حاصل ہوا کہ شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔

نہایت مشکل حالات کا بچپن اور ان کی کم سنی میں والد کے انتقال کے بعد پانچ بہنوں کے اکلوتے بھائی کی حیثیت سے گھریلو مسائل و مصائب نے خلیق احمد خاں کو خلیق انجم کس طرح بنایا، اس کی داستان واقعی سبق آموز ہے۔ دہلی میں ابتدائی تعلیم اور پھر مسلم یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے مدارج انہوں نے کس طرح طے کیے ہوں گے، ظاہر ہے زندگی کی سچائیوں کے اعتراف کے ساتھ غیر معمولی محنت اور مسلسل جدوجہد کی متاع ہی ان کے کام آئی ہوگی، لیکن ایک صفت یقیناً ان کے لیے زندگی کی راہوں کو آسان بنانے میں معاون ثابت ہوئی اور یہ صفت وہی ہے جو خود ان کے نام میں مضمر تھی، یقیناً وہ مرد خلیق تھے، اسم با مسمیٰ۔

اسی صفت اخلاق نے غالباً ان کو ادب و تحقیق اور انتظام و انصرام دونوں میں نمایاں رکھا، کہتے ہیں کہ ان کی کتابوں کی تعداد ۶۵ کے قریب ہے، لیکن جن کتابوں نے ان کی شہرت کو خلعت دوام عطا کی، ان میں یقیناً ان کا وہ تحقیقی و تدوینی سرمایہ سرفہرست رکھا جائے گا جو غالب کے خطوط کے مجلدات کی شکل میں ہے۔ غالب شناسی اور غالب فہمی کے لیے خطوط غالب کی جو اہمیت ہے اس کے پیش نظر ان سے پہلے مہیش پرشاد، غلام رسول مہر، امتیاز علی عرشی جیسے ائمہ غالب نے جمع و تدوین کی بنیاد رکھی۔ اس بنیاد پر خلیق انجم صاحب نے ایک عظیم الشان عمارت اس طرح قائم کی کہ متن کے مآخذ، ان کے تقابلی موازنہ اور اشخاص، مقامات، کتب و اخبارات کے حواشی اور ان خطوط میں موجود اردو فارسی کے اشعار کا اشاریہ سب کچھ آ گیا۔ متن کی تصحیح ایک محقق کے لیے غالباً سب سے دشوار گزار مرحلہ ہے، خلیق صاحب کو اس کوہ کنی کا یہ گُر معلوم تھا کہ محقق و نقاد کو ہر قدم پر ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وہ اس تحریر کی بازیافت کر رہا ہے جو مصنف کے ذہن میں تھی۔ اس تحریر کی نہیں جو

مصنف کے قلم سے نکلی یا شائع ہوئی، تاریخ وار ترتیب کے لیے تاریخ تحریر کا تعین اور متن کے املا پر نظر جیسی نزاکتوں کا احساس خلیق انجم صاحب کو جس طرح تھا، اس کا اندازہ اصل کتاب کے مطالعہ ہی سے کیا جاسکتا ہے، اس کے لیے غالب کے اردو املا کی خصوصیات کے عنوان سے ان کی بحث ہی کافی ہے۔ غالبیات میں ان کی اور بھی کتابیں آئیں اور اسی شان سے آئیں، جیسے غالب کی نادر تحریریں، غالب اور شاہان تیموریہ اور غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتہ کا ادبی معرکہ وغیرہ۔ آخر الذکر کتاب کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس سے ایسی معلومات فراہم ہوئی ہیں جن سے محققین غالب ابھی تک محروم تھے، ان کی ایک اور کتب جو بڑی وقیع ثابت ہوئی وہ متنی تنقید ہے، وقیع تو آثار الصنادید اور سیرت فریدیہ کے جدید مرتبہ ایڈیشن بھی تھے۔ ان سب کا ذکر عرصہ تک ہوتا رہے گا، یہاں ان کے اس نہایت قابل قدر کارنامہ کا ذکر بھی ضروری ہے جو انہوں نے انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے انجام دیا، انجمن کو انہوں نے فعال و متحرک بنا کر تمام اردو والوں سے غیر معمولی داد و تحسین حاصل کی۔ انجمن کا ہفت روزہ "ہماری زبان" پوری اردو دنیا کا ترجمان بن گیا اور انجمن صرف دہلی ہی نہیں پورے ملک کی انجمن اردو بن گئی۔ صحیح کہا گیا کہ بہرحال انہوں نے خود کو تنگنائے انجمن میں مقید نہیں رکھا۔ دوسرے اردو اداروں سے ان کا تعلق بڑا گہرا رہا، دارالمصنّفین بھی ان میں سے ایک تھا، اس کی جھلک معارف کی فائلوں میں دیکھی جاسکتی ہے، خاص طور پر سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم سے ان کو خاص عقیدت تھی، جس کی گواہی کے لیے ہماری زبان اور خود معارف کے صفحات موجود ہیں۔ یہی تعلق تھا جو ان کو مولانا سید سلیمان ندوی پر منعقد ہونے والے سمیناروں میں لاتا تھا، بہار اردو اکیڈمی کے ایسے ہی سمینار میں ان کے جوش کے وہ منظر کبھی فراموش نہیں ہوسکتے، جن میں وہ نثار احمد فاروقی، وہاب اشرفی اور لطف الرحمٰن کے ساتھ ایک نو وارد کے ساتھ نظر آتے رہے، انہوں نے انجمن ترقی اردو کے اہتمام میں ۸۵ء میں یہ کہتے ہوئے سید صاحب پر نہایت پروقار سمینار کرایا کہ سید صاحب انجمن کے محسن تھے۔ انہوں نے علی سردار جعفری کے خطوط کا ایک مجموعہ شائع یہ کہہ کر کہ ترقی پسند نظریات سے شدید وابستگی کے باوجود ان کے ہاں عصبیت نہیں تھی، اسی طرز فکر نے رابطہ ادب اسلامی کے سمیناروں میں شرکت اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے عقیدت کی راہ بھی ہموار کی۔ آخر کے برسوں میں عوارض نے ان کو گویا اردو دنیا سے دور کردیا تھا، عمارت کے اس طرح ڈھے جانے میں ممکن ہے دل کی شکستگی بھی وجہ رہی ہو۔ اب وہ نہیں ہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ع

کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمت و مغفرت سے نوازے، آمین۔

ع۔ص

ادبیات

حمد باری تعالیٰ

جناب سلمان غازی*

میرے خدائے لم یزل تیری ثنا میں کیا کروں
قلب و نظر کی کیفیت، لفظوں میں کیا ادا کروں

عقل سے تو ہے ماورا، تجھ کو سمجھ سکا ہے کون
دل میں تو جب ہے جاں گزیں، تجھ کو سمجھ کے کیا کروں

میرے ہر اک سوال پر تیرا کرم فزوں ہوا
تیری عطائے ناز سے مانگوں نہیں تو کیا کروں

وہ بھی نہیں دیا کہ جو، مجھ کو نہ خوش مآل تھا
جو کچھ نہ تھا نصیب میں اس کا تو کیا گلا کروں

سجدے میں رکھ کے سر کبھی راز کی بات کہہ سکوں
کاش یہی ہو ملتقا، تجھ سے یہیں ملا کروں

تو نے جو دی تھی زندگی مجھ پہ وہ اب بھی قرض ہے
میری بساط کیا کہ میں قرض ترا ادا کروں

میری سرشت میں گناہ روز ازل سے ہے رقم
بس تیرے فضل سے کروں جو بھی کروں بجا کروں

جوش نمو سے کیوں ابھی ابلے نہ چشمۂ حیات
تیرے لیے میں دل کو جب درد سے آشنا کروں

حمد یہ بے نوا تری، پیش کرے تو کس طرح
لفظ نہیں، زباں نہیں، حسن ادا کا کیا کروں

تیری بہشت میں اگر جائیں گے صرف صالحین
سجدے جو بس قبول ہوں اتنے پہ اکتفا کروں

ذات ہے تیری ذی وقار میرا وجود کسر شان
عفو میں شان ہے تری، کتنی بھی میں خطا کروں

عظمت رسول ﷺ

جناب انس مسرور انصاری**

کونین میں کسی کی نہ تکریم کی گئی
جتنی رسول پاک کی تعظیم کی گئی

آغوش آمنہ میں ہوئے جلوہ گر نبی
تجسیم یوں دعائے براہیم کی گئی

سائنس جیسے جیسے ہوئی ارتقا پذیر
عظمت مرے رسول کی تسلیم کی گئی

کھلتے گئے معانی و مفہوم اور بھی
جتنی کلام پاک کی تفہیم کی گئی

ساقی کے فیض عام پہ جاکر ہوئی تمام
جب گفتگوئے کوثر و تسنیم کی گئی

بعد از خدا بزرگ ہیں مسرورؔ مصطفےٰ
دونوں جہاں کی ملکیت اقلیم کی گئی

---

* پتہ؟؟

** سکراول ٹانڈہ، امبیڈکر نگر، یوپی۔

مطبوعات جدیدہ

تاریخ اصلاح و تربیت (جلد اول): مولانا محمود حسن حسنی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: ۶۵۶، قیمت: ۴۰۰ روپے، پتہ: سید احمد شہید اکیڈمی، دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی، یوپی۔

دس ابواب پر مشتمل اس کتاب میں رسول اکرمؐ، آپؐ کی ازواجؓ و بنات، خلفائے راشدینؓ اور حضرات حسنینؓ کی پاک زندگی اور ان کے اسوۂ حسنہ کو پیش کیا گیا ہے کہ رسالت کے مقاصد یعنی دعوت و تعلیم، اصلاح و تزکیہ اور ارشاد و تربیت کی خصوصیات اس طرح واضح ہو جائیں کہ ان کی روشنی میں آج کے انسان اور انسانی معاشرہ کی تزئین و تحسین آسان ہو سکے۔ یعنی انفرادی معاملہ ہو یا اجتماعی ضرورت، زندگی کے ہر پہلو اور ہر تقاضے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے زندگی کا جو نمونہ مطلوب ہے اس کو بڑی دیانت داری سے پیش کر دیا جائے اور اس میدان میں اصلاح و تربیت کا وہ منہج سامنے رہے جو رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ کی شکل میں اسوہ کامل بنا اور پھر آپؐ کے بعد بنی نوع انسان کے بہترین نمایندوں کی شخصیت میں اس کا ظہور ہوا۔ اس لحاظ سے یہ صرف سوانح ہی نہیں، معاشرہ کی اصلاح و تربیت کی بے نظیر عملی شکل کی تاریخ ہے۔ لائق مصنف نے جس محنت اور اس سے زیادہ جس دل سوزی سے یہ تاریخ مرتب کی ہے، اس کے لیے وہ مبارک باد اور ساتھ ہی شکریہ کے مستحق ہیں۔ کتاب کی نافعیت میں کوئی شک نہیں۔

تلخیص بحر الفصاحت: از جناب عارف حسن خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۴۴۸، قیمت: ۴۰۰ روپے، پتہ: ادارہ زبان و ادب، اے-۱۰۵، جگر کالونی مراد آباد، علی گڑھ اور دہلی کے مشہور مکتبے۔

علم عروض کے ذکر کے ساتھ بحروں کی ایجاد، تقطیع، صنعت وغیرہ جیسی اصطلاحوں اور ان کی تفصیلات سے عام لوگوں کے لیے شعری ریاضتوں کا یہ علم، علم ریاضی کی طرح نظر آتا ہے۔ اس لیے اب عموماً اس سے اعتنا بھی کم ہے، اس علم کے شائقین کے لیے البتہ مولوی نجم الغنی رامپوری کی بحر الفصاحت عزت و احترام کا درجہ رکھتی ہے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ اس کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے اور ہر کلاسک کی طرح گویا یہ اب نایاب و معدوم بھی ہے۔ اس کتاب کے مرتب کو جن کو علم عروض سے دلچسپی ہی نہیں اس میں مہارت بھی حاصل ہے۔ اس کے طبع نو کی خواہش ہوئی تو انھوں نے اصل کتاب کی با قاعدہ تصحیح و تخریج و تدوین کی جگہ سر دست اس کی تلخیص کر ڈالی اور اس ایمان داری کے ساتھ کہ کوئی اہم اور ضروری بات رہ نہ جائے۔ اس کوشش کے نتیجہ میں ایک عمدہ اور مفید کتاب گویا زندہ ہوگئی اور علم عروض سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے، جن میں شاعر و نقاد بھی شامل ہیں۔ یہ ایک بہترین تحفہ بھی ہوگی۔ ع۔ص

رسید کتب موصولہ

ادبی ولسانی تحقیق اور تقابلی ادب (اصول اور طریق کار): پروفیسر عبدالستار دلوی، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، انجمن اسلام کمپلیکس، دادا بھائی نوروجی روڈ، ممبئی۔

قیمت=/۲۰۰ روپے

اردو غزل کی سرحدیں: فاروق جائسی، ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، چینائی۔

قیمت=/۴۰۰ روپے

برہان پور کے اہم کتبات: مرتب ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری، فاضلی اردو سوسائٹی، برہان پور (ایم پی)۔

قیمت=/۷۰ روپے

پرندوں کے سائبان: ڈاکٹر یوسف اعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۹۱ وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت لال کنواں، دہلی۔

قیمت=/۲۵۰ روپے

خیال اپنا اپنا: محمد متین ندوی، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال۔

قیمت=/۱۵۰ روپے

سید عبدالفتاح اشرف علی گلشن آبادی اور قصیدۂ بردہ (ایک تحقیقی مطالعہ): ڈاکٹر سعیدہ اختر پٹیل، انجمن اسلام اردو، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی۔

قیمت=/۲۰۰ روپے

قرآن مجید بحیثیت ماخذ سیرت: مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی، ادارہ دعوت القرآن، کلن کی لاٹ، امین آباد، لکھنؤ۔

قیمت=/۳۰۰ روپے

قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز (اول، دوم): مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی، شعبۂ نشر و تحقیق جامعہ ربانی منورواشریف، سمستی پور، بہار۔

قیمت=/۳۰۰، ۳۵۰ روپے

محمد خالد عبادی ایک مطالعہ: مرتبین رضیہ حامد، رہبر جونپوری، مکتبہ عابدیہ، ۵۴۵، دل آرام ہاؤس، ہوا محل روڈ، بھوپال۔

قیمت=/۳۰۰ روپے

نعت، مرثیہ اور عرفان (ایک علمیاتی بحث): حیات عامر حسینی، مکتبہ جامعہ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔

قیمت=/۳۰۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	80/-
شعر العجم اول	150/-
شعر العجم دوم	130/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	150/-
شعر العجم پنجم	120/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	230/-
علم الکلام	180/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس و دبیر		100/-
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر		100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام		200/-
کلیات شبلی (اردو)		180/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		100/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی		
مقالات شبلی دوم (ادبی)	؍؍	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	؍؍	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	؍؍	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	؍؍	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	؍؍	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	؍؍	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	؍؍	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول	؍؍	150/-
مکاتیب شبلی دوم	؍؍	190/-
شذرات شبلی	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
December 2016 Vol- 198 (6)
RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/016
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

تصانیف ومطبوعات شبلی صدی تقریبات

۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	علامہ شبلی نعمانی تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	حیات شبلی (جدید)	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۸۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۹۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۱۰۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۱۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۲۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۳۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۴۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۵۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۶۔	تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۷۔	مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-